نظام زندگی

(حصہ اوّل)

(مصنفہ)

حضرت سید العلماء مولانا السید علی نقی النقوی دام ظلہ

(مطبوعہ الواعظ صفدر پریس کیننگ سٹریٹ لکھنؤ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید الانبیاء والمرسلین
وآلہ الطاہرین۔

تمہید

ایحسب الانسان ان یترک سدی

انسان کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ دنیا میں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا "یوں ہی" یعنی بغیر کسی نظم و قاعدہ اور آئین و قانون کے۔

بے نظم و بے اصول تو چھوڑا اُس وقت جا سکتا تھا جب اُس کا خالق ناسمجھ اور غیر ذی شعور ہوتا یا نظم و قانون کے عمل میں لانے سے عاجز ہوتا۔

دنیا کی ہر شے میں نظام قائم ہے اور یہ اُس نظام ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ وہ چاہے طب ہو اور چاہے سائنس، علم النباتات ہو یا علم الحیوانات جو بھی اس طرح کا فن ہو اُس کی حقیقت صرف نظام کائنات کے سمجھنے پر منحصر ہے۔

علوم کی بنیاد کلیات پر ہوتی ہے اور کلیات قائم ہی نہیں ہو سکتے جب تک

امامیہ مشن کی بہترین خدمت

"نظام زندگی" ایک اہم سلسلہ تصنیف ہے جس کی پہلی کڑی اس وقت پیش کی جا رہی ہے۔

انسانی زندگی کا نظام مذہبی تعلیمات کے رو سے عقلی و نقلی تحقیقات کے ساتھ درج کیا گیا ہے اور اس ذیل میں کثیر التعداد مسائل تعلیم و تربیت، اجتماع و تمدن، تہذیب اخلاق اور فلسفہ احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

امید ہے کہ افراد قوم اس حصہ کی اشاعت میں پورے انہماک سے کام لیں گے تاکہ اس سلسلہ کے دوسرے حصص بھی جلد شایع کیے جا سکیں۔

خادم قوم

سید مصطفے احسن رضوی

آنریری سکریٹری امامیہ مشن نخاس لکھنؤ

صفر ۱۳۵۹ھ

نظامِ زندگی کی ابتدائی داغ بیل

اس کے انتظامات کب سے شروع ہوئے ؟ اہل مذہب اس سلسلہ میں بڑی دُور کا پتہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب ہر انسان کی روح کا جسم سے تعلق بھی نہیں ہوا تھا اُس وقت روح کو سبق پڑھائے گئے اور اُس سے عہد و پیمان لیے گئے تھے۔ اُسے "عالم ذر" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور قرآن میں اُس پیمان کا تذکرہ موجود ہے (الست بربکم قالو بلیٰ) یقیناً مجھ کو اور میرے ایسے بہت سوں کو وہ عہد و پیمان یاد نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی انسان کو وہ یاد نہیں ہو سکتا۔ ایک خود فراموش کسی بات کو بھول جانے والا یہ حکم لگانے کا کیا حق رکھتا ہے کہ اُس کی طرح سب بھول جائیں گے ممکن ہے کہ بڑے قوی نفس اور ادراک والے ایسے انسان ہوں جن کی روح ان مادیات کے شکنجوں میں ظاہری طور پر گرفتار ہو کے بھی اُس عالم "الست" کو اور وہاں کے عہد و پیمان کو پوری طرح یاد رکھتی ہو مگر میں تو اپنے محدود ادراک و نفس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے وہ عہد یاد نہیں پھر بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ایک چیز جو کسی وقت یاد کر لی گئی ہو ممکن ہے کہ بعد میں فراموش ہو جائے اور اُس کا یاد کیا جانا بھی دماغ میں محفوظ نہ ہو مگر پھر جب وہ سبق پڑھایا جائے گا اور یاد کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اُس پہلی یاد کا مٹا ہوا نقش اس مرتبہ سہولت کا باعث ضرور ہو گا

باضابطہ نظام موجود نہ ہو۔ اتفاقیات کا کوئی معیار نہیں ہوتا اس لیئے اُن
کے دیکھنے سے بطور کلیہ کوئی اصول قائم نہیں ہو سکتا۔

پھر جب ہر شے بااصول ہے اور نظام کے تحت میں ہے تو یہ انسان غیر منظم اور
بے اصول کیوں ہو۔

بس فرق اتنا ہے کہ اُن تمام چیزوں کا نظم و ارتباط خالق عالم نے بالکل
اپنی قوت اور ارادہ کے ماتحت رکھا ہے لیکن انسان کو "انسان" بنانا تھا
اور اُس کی انسانیت اپنی اختیاری طاقتوں کے عمل میں لانے سے وابستہ ہے
اس لیئے اس کے افعال و اعمال کے نظم و آئین کو اس کے ارادہ و اختیار
سے وابستہ قرار دیا اور اپنی جانب سے اُس نے اس بارے میں حکمرانی اور ہدایت
پر اکتفا کی یعنی تمام دوسری چیزوں کا انتظام "ادارۂ تکوین" سے متعلق
اور انسان کا انتظام "ادارۂ تشریع" سے متعلق ہے۔

بیشک احکام شرعیہ کے تحت میں ہر طرح اس انسان کی عملی زندگی کے آراستہ
بنانے کا انتظام کیا گیا اور انسان کے ہر دور حیات سے متعلق اس طرح اہتمام کیا
گیا کہ یہ انسان صحیح طور پر ایک نظام و اصول اور آئین کا پابند ہو اس کے
لیئے اُس نے شرعی ہدایات کے ذریعہ سے ایک مکمل "نظام نامۂ زندگی" یا
"دستور العمل حیات" ہم تک پہونچا دیا جس کے پورے طور پر پابند ہونے ہی میں ہماری
اصلاح اور کامیابی مضمر ہے۔

ارادہ کرتا ہے اسی وقت اس طرح کے ہدایات ہیں کہ ہر عورت کے ساتھ سمجھ کر نکاح
کرکے وہ شادی نہ کرے بلکہ قدرت انتخاب سے کام لے۔ ایسی عورتوں سے اور ایسے
گھرانوں میں شادی کرے جو عادات و افعال کے لحاظ سے جوہر شرافت و انسانیت
کے حامل ہوں۔ یہ اس لیے ہے کہ اس عورت سے پیدا ہونے والی اولاد بُرے اوصاف
وخصائل کی طرف رجحان نہ رکھتی ہو اور بُرے اثرات کی حامل نہ ہو۔

یہ امر کسی طرح شک و شبہ کی گنجائش نہیں رکھتا کہ بہت سے اوصاف وراثتا
کے ذریعہ سے اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہیں وہ لوگ جو جانوروں کی تربیت کا
شوق و ذوق رکھتے ہیں اس قسم کے تجربات حاصل کرتے رہتے ہوں گے کہ
ایک ادنیٰ قسم کے جانور کا تعلق اعلیٰ قسم کے جانور سے پیدا کرکے کس طرح اُس
کی نسل کو رفتہ رفتہ بلند درجہ پر لایا جاتا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اوصاف میں وراثت کا قانون جاری ہے
پھر اخلاق و عادات، یہ اکثر مزاج طبعی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ
بالکل غیر قابل تبدیلی نہ ہوں بلکہ قوت کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرنے پر اُن میں تبدیلی
ہوسکے لیکن پھر بھی طبیعت کا تقاضا کسی خاص طرح کے افعال کے لیے ایک ناقابل
انکار حقیقت ہے اور جبکہ مزاج طبعی ماں باپ کا اولاد کی طرف منتقل ہوتا ہے
تو خصائل و عادات کی یگانگت اُسی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔

اس بنا پر ضرورت ہے کہ باپ اور ماں افعال و کردار کے لحاظ سے بلند

اور اتنی دشواری اس میں نہ ہوگی جتنی بالکل کسی نئے سبق کے یاد کرنے میں ہوتی اسی طرح عالم "الست" کا ہونا ضرور انسانی نفوس کو ان کے موجودہ دور میں معرفت و اطاعت کے درجہ سے قریب کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے

مگر یہ اعتقاد سے متعلق خبر ہے جو شخص اس جسم سے پہلے روح کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اور "عالم ذر" کو کوئی چیز نہ سمجھتا ہو وہ میرے اس بیان کو بالکل غلط اور بے بنیاد سمجھے گا۔

پھر آیئے آگے بڑھیں اور اسی دور کا مطالعہ کریں کہ جب یہ انسان مادی حیثیت سے عالم وجود میں آتا ہے یعنے دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ احکام شریعت نے اس کی پیدائش کے پہلے ہی سے اس کی آئندہ عملی زندگی کی اصلاح کی طرف توجہ رکھی ہے۔

رابطۂ ازدواج میں مستقبل کا لحاظ

اولاد کے مفاد کیلئے ماں کا انتخاب

شریعت نے اس انسان کی زندگی کی اصلاح کا اس وقت سے انتظام کیا ہے جس وقت کہ ابھی اس نے دنیا میں قدم نہیں رکھا ہے وہ ابھی کسی پردہ میں پوشیدہ بھی نہیں ہے بلکہ اس کا آئندہ بھی موجود ہونا کوئی یقینی امر نہیں، صرف ایک توقع بعید کی حیثیت رکھتا ہے یہ وہ وقت ہے جب کہ اس کا باپ شادی کرنے کا

کا عقد زید بن حارثہ کے ساتھ کر دیا جو بظاہر غلام کی حیثیت رکھتے تھے اور ضبیعہ بنت الحارث کا عقد مقداد کے ساتھ کر دیا۔

اسی طرح مال و دولت کے اعتبار سے تفرقہ جو عام طور سے قابل لحاظ سمجھا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ لڑکی والے اس امر کا لحاظ کریں تو پھر بھی صحیح ہے اس لیے کہ اُس لڑکی کی زندگی، اُس کا نان و نفقہ سب مرد کے ساتھ وابستہ ہے لیکن آجکل وہ لڑکے والے اس امر کو دریافت کرتے ہیں کہ لڑکی صاحب جائداد ہے یا نہیں اور وہ کتنے دولتمند گھرانے سے تعلق رکھتی ہے یہ بہت افسوسناک ذہنیت ہے بعض افراد حُسن و جمال کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اب موجودہ زمانہ میں اخباروں میں شادیوں کے لیے جو اعلانات ہوتے ہیں اُن میں اکثر خوبصورتی کا تذکرہ موجود ہوتا ہے شرعی تعلیمات میں ان دونوں باتوں کے لحاظ کو بیجا قرار دیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ جو مال و جمال کو صرف اپنا مقصد قرار دیگا وہ ان دونوں باتوں سے محروم ہوگا۔

وہاں کس اعتبار سے تفریق قرار دی گئی ہے؟ عقائد و اعمال کے لحاظ سے۔ کافر اور مسلم کفو نہیں ہیں اُن کی شادی بالکل ناجائز۔ کیونکہ عقائد و اعمال کا اثر اولاد پر پڑنا ضروری ہے۔ اسی طرح بدسیرت اور غیر شریفانہ افعال کی مرتکب عورتوں کے ساتھ شادی کی ممانعت۔

قرآن مجید میں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ الزانی لا ینکح الا زانیۃ

اور پاکیزہ ہوں تاکہ اُن کے صفات کا عکس اولاد کے اوپر پڑ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں شریعت نے پابندیاں عائد کرنا ضروری خیال کی ہیں۔

دنیا میں شادی بیاہ کے مسئلہ میں مختلف حیثیتوں سے تفریق قائم کی گئی ہے کبھی اونچ ذات اور نیچ ذات دیکھی جاتی ہے۔ یہ بات ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ ادھر کسی کا ذکر ہوا، کہا گیا وہ تو کم ہے۔ اُس کی ذات خراب ہے وہ برابر والا نہیں ہے۔ اس تفریق کو مذہب اسلام نے بالکل ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔

یہ یہود و نصاریٰ کی ذہنیت تھی کہ وہ بنی اسمٰعیل کو جن میں سے رسول اللہؐ تھے اپنے سے کم درجہ پر سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ ہم بیوی کی اولاد ہیں اور یہ لونڈی کی نسل سے ہیں ان کو ہمارے مقابلہ کا حق نہیں مگر شریعت اسلام نے یہ عام اعلان کیا کہ نسلی تفریق کوئی چیز نہیں ہے انا جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا (یہ تو فقط شناخت کے لیئے خاندانوں کی تفریق قرار دی گئی ہے اس سے عزت میں کوئی فرق نہیں آتا) اور حضرت رسول اللہؐ نے صاف اظہار کر دیا کہ لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی۔

"کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور عربی کو غیر عربی پر"

قرآن میں ہے۔ خلقنا کم من نفس واحدۃ۔ تم سب ایک ہی ہو پھر تفریق کیسی؟ خود رسول اللہؐ نے اپنی بہت قریب کی عزیزہ زینب بنت جحش

نہ نیکو کار عورت کے لئے اور نہ بدکار کے لئے۔ اگر نیکو کار عورت ہی تو سونا چاندی بھی اسکے مقابل نہیں آسکتے بلکہ وہ سونے اور چاندی سے بہتر ہے اور اگر بدکار ہے تو مٹی بھی اُس کے مقابل نہیں کیونکہ مٹی بھی اُس سے بہتر ہے۔"

صورت کا حسن و جمال سیرت کی خرابی کے ساتھ کوئی چیز نہیں اسکو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے کہ :- ایھا الناس ایاکم و خضراء الدمن -

"خبردار اُن باغوں سے بچتے رہو جو گھوڑے پر اُگے ہوئے ہوں"، پوچھا گیا کہ اس کا مطلب ؟ فرمایا - المرأة الحسناء فی منبت السوء

"خوبصورت عورت برے سیرت و کردار کے ساتھ"

یہ ہی شریعت کی وہ بندشیں جو نسل انسانی کے آراستہ بنانے کیلئے پہلے سے کی گئی ہے۔

آدابِ نکاح میں انسانی ذہنیت کی تشکیل

شادی بیاہ عام طور پر انسانی نفس کے تقاضا کا نتیجہ ہے مگر یہ اسلام کی حکیمانہ روش ہی کہ اُس نے شادی کے مسئلہ میں اس قدر حدود و قیود اور آداب و قواعد عائد کردیے ہیں جن کے بعد وہ ایک فرض اور شرعی رسم کی صورت سے عمل میں آتا ہے۔ اس میں بڑا رمز یہ ہے کہ جو چیز صرف جذبات کے تحت میں عمل میں لائی جائے اُس کے نتائج کی اصلاح پر انسان کو توجہ

او مشرکۃ والزانیۃ لاینکحہا الا زان او مشرک۔ اس کا یہ مقصد ہے کہ
برے افعال کے جراثیم اپنے مرکز سے متعدی ہو کر کسی صاف فضا کو بھی مکدر بنا دیں
"ماں کا انتخاب" اولاد کے مفاد کی خاطر ہے اس کے لیے ملاحظہ ہوں ذیل
کی احادیث:- امام جعفر صادقؑ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ اختاروا لنطفکم
فان الخال احد الضجیعین یعنی اپنے نطفوں کے لیے محل کی تلاش میں انتخاب
سے کام لو کیونکہ ننھیال کا بچہ پر بڑا اثر پڑتا ہے"

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

الشجاعۃ فی اهل خراسان والسخاء والحسد فی العرب فتخیروا
لنطفکم "خراسان کے لوگوں میں شجاعت کی صفت ہے اور عربوں میں سخاوت ہے
اور رشک، لہذا اپنے نطفوں کے لیے سمجھ بوجھ کر انتخاب کرو"

اس امر میں سب سے زیادہ لحاظ سیرت اور خصائل و عادات ہی کا ہے امام
جعفر صادقؑ فرماتے ہیں "انما المرأۃ قلادۃ فانظر الی ما تقلدہ" "عورت
گلے کا ہار ہے۔ ذرا غور کر لو کہ تم کیسی عورت کو گلے کا ہار بنا رہے ہو" ارشاد ہوتا ہے
لیس للمرأۃ خطر لا لصالحتہن ولا لطالحتہن اما صالحتہن فلیس خطرها
الذهب والفضۃ بل هی خیر من الذهب والفضۃ واما طالحتہن
فلیس التراب خطر ها بل التراب خیر منها۔

"عورت کی کوئی قیمت نہیں یعنی کوئی شے نہیں جو اس کے مساوی ہو سکے

نَفْسِهَا وَفِيْ مَالِيْ وَاَوْسِعْهُنَّ رِزْقًا وَاَعْظَمْهُنَّ بَرَكَةً وَاقْدِرْ لِيْ مِنْهَا
وَلَدًا طَيِّبًا تَجْعَلُهُ خَلَفًا صَالِحًا فِيْ حَيَاتِيْ وَبَعْدَ مَوْتِيْ۔

(یعنی) ”خداوندا میں چاہتا ہوں کہ شادی کروں۔ بارالٰہا تو مقرر کر میرے لیے عورتوں میں سے وہ جو سب سے زیادہ پارسا ہو اور اپنی ذات اور میرے مال و دولت کے بارے میں میری امانت کی حفاظت کرنے والی ہو اور اچھی قسمت والی اور مبارک ہو اور مقرر کر میرے واسطے اس سے ایک پاکیزہ فرزند جو صالح اور نیک عمل ہو اور میرا جانشین ہو میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد بھی“

پھر جب شادی ہو جائے اور عورت کو بیاہ کر گھر میں لائے تو اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھے اور یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ عَلٰى كِتَابِكَ تَزَوَّجْتُهَا وَفِيْ اَمَانَتِكَ اَخَذْتُهَا وَبِكَلِمَاتِكَ اسْتَحْلَلْتُ فَرْجَهَا فَاِنْ قَضَيْتَ فِيْ رَحِمِهَا شَيْئًا فَاجْعَلْهُ مُسْلِمًا سَوِيًّا وَلَا تَجْعَلْهُ شِرْكَ شَيْطَانٍ

(یعنی) خداوندا تیری کتاب کے مطابق میں نے اس سے شادی کی ہے اور تیری ذمہ داری پر میں نے اس کو لیا ہے اور تیرے مقرر کردہ الفاظ کے ذریعہ سے اب میں نے اس کو اپنے لیے جائز بنایا ہے اب اگر تو نے اس کے بطن سے کوئی اولاد میرے مقدر میں قرار دی ہے تو اسے بالکل صحیح مسلمان بنانا اور اس میں شیطان کو شرکت کا موقع نہ دینا“

”سویا“ کی لفظ کے معنی ہیں ”تام و کامل“ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ آنکھ ناک کان (

کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور اُس کا صرف خواہش نفس کی بنا پر عمل میں آنا خود ہی اُس کے مطلق العنان ہو جانے کا محرک ہے مگر جبکہ وہ امر فرض وقانون کی بنا پر عمل میں آئے گا تو انسان کو اُس کے نتائج کی طرف توجہ بھی پیدا ہوگی اور ان کی اصلاح کی فکر ہوگی۔

شادی کے وقت سے اولاد کے مفاد کو کس حد تک پیش نظر رکھا گیا ہے اس کو آپ ان دعاؤں سے سمجھ سکتے ہیں جن کے پڑھنے کی اس موقع پر ہدایت ہوئی ہے۔ یہ دعائیں جو استحبابی طور پر وارد ہوئی ہیں ظاہر میں بالکل معمولی چیز سمجھی جاتی ہیں مگر ان دعاؤں ہی میں وہ روح مضمر ہوتی ہے جو کسی عمل کی اصل بنیاد ہے یا اُن میں اُس مفاد و منشا کی جانب اشارہ ہوتا ہے جو اُس عمل میں مضمر ہے۔ اُن سے انسانی دماغ میں وہ خیالات راسخ کیے جاتے ہیں جن کا پیش نظر رکھا جانا شارع کو مدنظر ہے۔

اب دیکھیے امام جعفر صادقؑ نے ابوبصیر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ اذا تزوّج احدکم کیف یصنع "جب تم میں سے کسی کی شادی ہوتی ہے تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟" ابوبصیر نے عرض کیا ما ادری جعلت فداک "مجھے نہیں معلوم فدایت شوم"۔ حضرت نے فرمایا جب شادی کا ارادہ ہو تو دو رکعت نماز پڑھے اور حمد خدا بجا لائے اور کہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اَتَزَوَّجَ اَللّٰھُمَّ فَاقْدِرْ لِیْ مِنَ النِّسَاۤءِ اَعَفَّھُنَّ فَرْجًا وَّاَحْفَظَھُنَّ لِیْ فِیْ

لوگوں کو تین چار برس کی باتیں یاد رہتی ہیں اور بعض کو اس سے کم سنی کی، پھر جبکہ اس کا کوئی عقلی معیار نہیں اور اختلاف درجات اس میں محسوس طریقہ سے ظاہر ہے تو ہمیں یہ سمجھنے کا کیا حق ہے کہ کسی کو اپنی پیدائش کے بعد کی باتیں یاد نہیں رہ سکتیں۔

پھر اسے یوں کیوں نہ سمجھ لیجیے کہ جیسے اہل دنیا نے اپنے مذاق کے مطابق شگون مقرر کیے ہیں جن سے ان کی آرزو کا اظہار ہوتا ہے کہ مستقبل کے حالات اس طرح ہوں شریعت نے ان کی ذہنیت کو بدلنے کے لیے اپنی جانب سے یہ ایک شگون مقرر کیا ہے جس سے اس آرزو کا انسانی ذہن میں پیدا کرنا مقصود ہے کہ یہ بچہ آگے بڑھ کر اس راستے پر قائم رہے گا اور ان فرائض کی پابندی کرے گا

رضاعت کا انتظام

بچہ کی غذا قدرت نے دودھ مقرر کی ہے اس کے لیے اکثر ضرورت پڑتی ہے کہ اناؤں کے ذریعہ سے دودھ پلوایا جائے اور کبھی بلا ضرورت بھی رئیس خاندانوں کی عورتیں خود اس امر سے احتراز کرتی ہیں اور انا ملازم رکھتی ہیں اس امر میں شریعت کی جانب سے پہلے تو یہ تاکید ہے کہ ماں خود رضاعت کرے اور انا مقرر ہی نہ کی جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین ارشاد فرماتے ہیں ما من لبن رضع به الصبی اعظم برکة علیه من لبن امه "کوئی دودھ جس سے

اُس لحاظ سے تعبیر ہوگا "ذکر کیا سو گیا" اس کے معنی ہوں گے تمام اختلاف لڑکا
اور یہاں چونکہ مسلما سوتا ہے اس لیے معنی یہ ہوں گے کہ "پورا مسلمان"
جس سے اشارہ اعتقاد و عمل دونوں کے صحت و کمال کی طرف ہوگا۔ پھر کہا
گیا کہ اس نے شیطان کی سرکشی کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شیطانی رہنموں
کا سالک ہے یعنی برائیوں کا ارتکاب کرنے والا ہے جن کی تحریک شیطانی
طاقتوں کی جانب سے ہے۔

ان دعاؤں کے پڑھنے سے انسانی ذہنیت کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ مقصد
دل نشین ہوتا ہے کہ پیدا ہونے والی اولاد کو کس طرح کا ہونا چاہیئے۔

وقت ولادت کے احکام

اب وہ وقت آیا کہ جب بچہ کی ولادت ہوئی اس وقت شریعت
کی ہدایت ہے کہ داہنے کان میں اذان کہی جائے اور بائیں کان میں اقامت
اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سے پہلے اس کو پیغام پہونچایا جائے وحدانیت خدا
رسالت اور فرائض کی بجا آوری کا۔ ممکن ہے ہم کہیں کہ اس سے فائدہ کیا
جبکہ وہ ہم کو یاد نہیں رہتا۔ اس کے متعلق ہیں علماء کی بحث ہیں کہ یہ کیا ہوں
کہ ہم کو یاد نہیں تو یہ ضروری نہیں کہ کسی کو بھی یاد نہ رہے۔ بچپن کے واقعات
کی یادداشت کے درجے تو مشاہدہ و تجربہ کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں یعنی بہت سے

اظہار کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اُس کے دوسرے اوصاف کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے تاکہ بچہ کے اوصاف پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ انظروا من یرضع اولادکم فان الولد یشب علیہ ''ذرا دیکھ بھال لو کہ تمہاری اولاد کی رضاعت کس طرح کی عورت کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اسی کے آثار پر جو دودھ سے پیدا ہوں لڑکا جوان ہوگا''

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ لا تسترضعوا الحمقاء فان اللبن یعدی وان الغلام ینزع الی اللبن ''کم عقل عورت سے دودھ نہ پلواؤ اس لئے کہ دودھ تعدی کا باعث ہوتا ہے اور بچہ دودھ کے خواص کی طرف کھنچ جاتا ہے''

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے تخیروا للرضاع کما تخیرون للنکاح فان الرضاع یغیر الطباع۔ ''رضاعت کے لئے اُسی طرح انتخاب کام لو جیسے شادی کے لئے انتخاب کرتے ہو اس لئے کہ رضاعت کا اثر طبعی خواص پر عائد آجاتا ہے اور طبیعت میں تبدیلی کر دیتا ہے''

دُودھ بڑھائی کے بعد

جب دو برس بچہ کی عمر کے پورے ہو جائیں تو شرعاً دُودھ دینے کی آخری مدت ہے خود قرآن مجید میں مذکور ہے والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین اس آیت سے وہ امر بھی ظاہر ہے جس پر میں نے پہلے

بچہ کی رضاعت ہو اُس کے لیے ماں کے دودھ سے زیادہ مبارک نہیں ہے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ غذا جس قدر مناسب مزاج ہوگی اُسی قدر اُس کا فائدہ زیادہ ظاہر ہوگا اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بچہ جو مثل اپنی ماں کے ایک جزو ہے اُس کے لیے خود اُسی ماں کے دودھ سے زیادہ کوئی چیز مناسب مزاج نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر ضرورت ہو انّا مقرر کرنے کی یا بامر مجبوری بھی ماں اپنے فرض کو انجام نہ دے اور انّا مقرر کرے تو تاکید ہے کہ انّا کے بارے میں انتخاب سے کام لیا جائے۔ ہر ایک کا دودھ بچہ کو نہ دیا جائے اس لیے کہ اُس کا اثر اس بچہ کے اوصاف و افعال پر پڑے گا اور وہی خو بو اس میں قائم رہے گی۔

چنانچہ تاکید ہے کہ یہودیہ، نصرانیہ، اور مجوسیہ سے دودھ نہ پلوایا جائے۔ اگر اتفاق سے یہ امر ناگزیر ہو تو بچہ کو اُسے دیا نہ جائے کہ وہ اپنے گھر لے جائے بلکہ اُس کو بلا کر اپنے یہاں رکھا جائے اور خمر و خنزیر کے استعمال سے اُس کو روک دیا جائے مقصود یہ ہے کہ اگر وہ ان چیزوں کا استعمال کرے گی تو ان سے خود اُس کا خون تیار ہوگا اور وہ دودھ کی شکل میں آئے گا اور وہ اس بچہ کے جسم میں جا کر اس کے خون کی صورت اختیار کرے گا۔ شریعت کو کسی صورت سے بھی یہ منظور نہیں کہ مسلمان کے جسم میں ان چیزوں کی شرکت پیدا ہو۔

ناصبی عورت سے بھی رضاعت کی ممانعت ہے وہ وہ ہے جو عداوت اہلبیتؑ کا

تربیت کا زمانہ

(اور)

ماں باپ کی ذمہ داریاں

جس وقت سے کہ بچہ سات یا چھ برس کا ہو اب اُس کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔

یہ بالکل غلط خیال ہے کہ ایک انسان صرف اپنے اعمال کا جوابدہ ہے بلکہ اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت اُس کا اہم فرض ہے۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات سے بہت اچھے ہیں پابند صوم و صلوٰۃ ہیں و تمام احکام شرعیہ پر عامل ہیں مگر اپنی اولاد کی طرف اُنھوں نے کوئی توجہ نہیں کی ہے۔

ایسے لوگ یقیناً پیش خدا جواب دہ ہیں بلکہ مجھے خود اُن کے حُسن عمل میں تامل ہے۔ کیونکہ ان کی ظاہری پابندی شرع احکام شرع کی اہمیت کے احساس کی بنا پر نہیں ہے۔ اگر انہیں فرائض شرعیہ کی اہمیت کا صحیح احساس ہوتا تو کبھی وہ اپنی اولاد کو اس طرح مطلق العنان نہ چھوڑ دیتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں بچہ کی معمولی معمولی باتوں کا جو اس زندگی سے متعلق ہیں خیال ہے۔ کسی وقت دوپہر کو گرمی میں اور لو کی شدت میں بچہ باہر نکلنا چاہتا ہے

تبصرہ کیا تھا کہ مطلوب اولین شرع کا یہی ہے کہ خود ماں اپنے بچہ کو دودھ پلائے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے کہ "مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو برس" اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دو برس کے بعد کوئی عورت بچہ کو دودھ پلائے تو وہ احکام جو شرعاً رضاع کے لیے مقرر ہیں مترتب نہ ہوں گے۔ نہ وہ اس کی ماں قرار پائے گی۔ نہ اُس کی اولاد اس کی بھائی بہن وغیرہ۔ اس حکم میں کوئی خصوصیت لڑکے لڑکی کی نہیں ہے۔ "اولادھن" کی لفظ دونوں کو عام ہے۔

اب اس کے بعد چار یا پانچ برس بچہ کو کھیل کود لینے دینا چاہیئے یہ زمانہ تعلیم و تربیت اخلاق کا نہیں ہے اس لیئے کہ ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ بیشک اس دوران میں بھی ایک حد تک نگرانی ضروری ہے اُن چیزوں کے متعلق جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے مثلاً شراب وغیرہ کا استعمال نہ ہونے دے نیز کسی دوسرے کی نقصان رسانی کا باعث نہ ہو مگر یہ چیز تربیت و تعلیم کی حیثیت سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ویسا ہے۔ جیسے جانور اپنا ہو تو اُس کے ذریعہ سے کسی کو نقصان پہونچنے سے دبنا چاہیئے اور شراب وغیرہ سے روکنا اُس طرح جیسے زہر سنکھیا کے استعمال سے اس بچہ کو روکنا تاکہ اس میں مضر جراثیم اور مہلک سمت پیدا نہ ہو جائے۔ یہ ایک باپ یا سرپرست کا ذاتی فرض ہے بچہ کی تعلیم سے اس کو تعلق نہیں ہے۔

میں بہت زیادہ اُسے اپنے نفس کی نگرانی کی ضرورت ہے یاد رہے کہ اگر اولاد کی تباہی اس کے ہاتھوں ہوئی اور اس کی نسل خود اس کے سبب سے گمراہی میں مبتلا ہوئی تو وہ خود دنیا سے اُٹھ جائیگا جب بھی اُس کے نامۂ عمل میں گناہوں کا سلسلہ قائم رہے گا کیونکہ وہ ذمہ دار ہے ان تمام خراب نتائج کا جو اس کے بعد رونما ہو رہے ہیں۔

اب ملاحظہ کیجیے کہ تربیت اولاد کے لیے شرع نے کس طرح انتظام کیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں "دع ابنك يلعب سبع سنين والزمه نفسك سبع سنين" ۔ "سات برس تک بچہ کو کھیلنے دو، اور پھر سات برس اُسے بالکل اپنا پابند بنائے رکھو یعنی اُس کے افعال و اعمال کی سختی کے ساتھ نگرانی کرو"۔ دوسری حدیث میں ہے۔

"امهل صبيك حتى ياتي له ست سنين ثم ضمه اليك سبع سنين" "اپنے بچہ کو مُہلت دو یہاں تک کہ اُس کی چھ برس کی عمر ہو۔ پھر سات برس تک اُسے بالکل اپنے ساتھ رکھو" یہ مدت کا اختلاف اس بنا پر ہے کہ حقیقتاً اس کے لیے کوئی تعبدی حیثیت سے عمر نہیں مقرر کی گئی ہے بلکہ غالبی حیثیت سے عمر کا ایک تخمینہ بتلایا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب بچہ کچھ سمجھدار ہو جائے اور تعلیم و تربیت کا اُس پر اثر پڑ سکے ۔ یہ بات بعض بچوں میں پانچ یا چھ برس ہی میں حاصل ہو جائے گی اور بعض کے یہاں سات برس یا اس سے زیادہ میں

ماں باپ ڈانٹ دینگے، روکیں گے اور زبردستی سے کام لیں گے کہ وہ باہر نہ جائے کس لیے؟ اس واسطے کہ لوہ کی گرمی اس کو تکلیف نہ پہونچائے پھر اس لوہ کی گرمی کا اتنا خیال مگر آخرت کے عذاب کی کوئی پرواہ نہیں آتش جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا کوئی خیال نہیں وہ آزادی کے ساتھ اپنی اولاد کو ایسے راستوں پر چلنے دیتے ہیں جو انھیں غضب خداوندی کا مستحق بنائیں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صحیح احساس روز قیامت کے حساب اور احکام خدا کی اطاعت کا نہیں ہے۔ پھر یہ خود جو شرع کے پابند نظر آتے ہیں اس کو صرف ان کے والدین کے احساس فرض کا نتیجہ سمجھیے کہ انھوں نے ان کو عادی بنا دیا ہے ان احکام کے بجا لانے کا۔ اس لیے یہ اس کی پابندی کرتے ہیں ورنہ خود ان کے دماغ میں کوئی خاص اہمیت ان احکام کی موجود نہیں ہے۔

اس سے زیادہ قابل اعتراض ہے اُن اشخاص کا طرز عمل جو اپنے افعال و اعمال سے اپنے بچوں کے لیے غلط مثال قائم کرتے ہیں اور برائیوں کے لیے اُن کی ہمت افزائی کا باعث ہوتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان کے لیے تنہائی میں کسی جرم کا ارتکاب کر لینا اُتنا بُرا نہیں ہے جتنا اپنی اولاد کے علم و اطلاع میں اس قسم کے افعال کا مرتکب ہونا۔ اگر جوانی کے دور میں کسی سے بے راہ روی ہوئی ہو تو خیر اُس پر خدا سے مغفرت کا متوقع رہے مگر اب اولاد کی موجودگی

بچہ جب اس سات برس میں اخلاق و عادات حسنہ کا پابند ہو گیا اور ایسی تعلیم بھی اس کو دے دی گئی جو اُس کے معاش و معاد دونوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہے تو اب وہ وقت ہے کہ عملی طور پر اُس کو مشکلات دنیا کا حل کرنا سکھلایا جائے۔ اب باپ اُس کو بحیثیت ایک معین زندگی اور مددگار کے اپنے مخصوص کاموں میں اور مشکلات کے حل کرنے میں شریک کرے اور اُس کے قوائے عمل کی تکمیل کرے۔

اس کو امیر المومنین ؑ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔ یربی الصبی سبعا ویؤدب سبعا ویستخدم سبعا " سات برس تک بچہ کو آرام دینا چاہیے پھر سات برس تک اُسکے اخلاق و عادات کی اصلاح کرنا چاہیے پھر سات برس تک اُس سے کام لینا چاہیے"

اس کو رسالتمآب ؐ نے بہت زیادہ بلیغ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:۔

قال النبی ؐ الولد سید سبع سنین وعبد سبع سنین ووزیر سبع سنین " بچہ سات برس تک بادشاہ ہے یعنی جو چاہے کرے کوئی روک ٹوک نہیں۔ پھر سات برس غلام ہے اس لیے کہ ابھی اس میں عقل و شعور اتنا نہیں کہ وہ اچھائی بُرائی سمجھ سکے مگر بادل ناخواستہ صرف باپ کے دباؤ سے وہ اُس کے بتلائے ہوئے افعال کو کریگا۔ یہ اُس طرح کی جبری اطاعت ہے جیسے غلام اپنے آقا کی کرتے ہیں پھر اس کے بعد سات برس یعنی پندرہ سے اکیس تک وہ وزیر ہے یعنی اُس میں اب خود عقل آگئی اب وہ خود سمجھ کر باپ کا دست و بازو بن کر

ابتدائی تعلیم

اس مدت میں ایک طرف تو بچہ کے اخلاق و افعال کو درست کرنا چاہیے دوسری طرف اس کو احکام شرعیہ اور فرائض سے واقف بنانا چاہیے اس لیے کہ اس کے بعد عنقریب وہ وقت آجائے گا جب اس پر حکم تکلیف جاری ہو جائے اور وہ فرائض کی ذمہ داری میں گرفتار ہو جائے۔ اس کے لیے اسے پہلے سے تیار ہونے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ شریعت نے ضروریات دنیا کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے امیر المومنین کی روایت ہے کہ رسالتمآب ؐ نے فرمایا علّموا اولادکم السّباحۃ والرماءۃ "اپنی اولاد کو پیراکی اور تیراندازی کی تعلیم دو"

یہ وہ چیزیں جو دنیاوی زندگی کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ یہاں ان دونوں چیزوں کا تذکرہ بطور مثال ہے "تیراندازی" کے بجائے اگر کسی وقت میں کوئی دوسری صورت اس کی قائم مقام ہو جائے تو اس کی تعلیم کی ہدایت ہوگی اسی طرح پیرنے کی طرح اگر کشتی کا رواج ہو جائے تو کشتی رانی بھی اس میں داخل ہو سکتی ہے۔ یہ چیزیں حیات دنیا کے لیے ہیں اور اسلام دنیاوی زندگی کی تقویت کا حامی ہے۔ یہ غلط ذہنیت ہے کہ ان تمام چیزوں کو عیب سمجھ لیا گیا ہے۔ یا ورع و تقویٰ کے منافی قرار دے لیا گیا ہے۔

دماغ میں مذہب کے خلاف خیالات راسخ ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام معتقدات و روایات خرافات و اوہام کے سوا کچھ نہیں ہیں اب اگر آپ اس کی مذہبی اصلاح کرنا بھی چاہیں تو نہیں ہو گی اس لیے کہ وہ سننے پہ آمادہ ہی نہ ہو گا اور سنے گا تو اس خیال کو لے کر یہ بالکل مہمل باتیں ہیں اس لیے اس پر اثر نہیں ہو گا - یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم پورا سبب گمراہی کا نہیں ہے بلکہ یہ غلط طرز عمل گمراہی کا سبب ہے -

اگر مذہب کی بنیادیں مضبوط ہو گئی ہوتیں تو بڑے بڑے شبہات و اعتراضات کو وہ برداشت کر لیتے مگر یہاں پر مذہب کی بالکل مستحکم نہیں ہے اس لیے کہ یا تو مذہبی معلومات ہیں ہی نہیں یا ہیں تو صرف تقلیدی حیثیت سے اس لیے معمولی سا اعتراض و ایراد جو کسی حلقہ سے گوش زد ہو جاتا ہے اس کے اعتقاد کو متزلزل کر دیتا ہے -

معصومین کے کلمات میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے - اگرچہ اس زمانہ میں مغربی تعلیم نہیں تھی - انگریزی مدارس موجود نہیں تھے مگر دوسرے گمراہ کن حلقے ایسے تھے جن کے لحاظ سے یہ تاکید کی گئی ہے کہ تم اپنے تعلیمات بچوں کے ذہن میں راسخ کر دو کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے اثرات ان پر پہلے پڑ جائیں پھر ان میں قبول حق کی صلاحیت نہ باقی رہے -

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :- بادروا احداثکم بالحدیث قبل ان

زندگی کی منزلوں کو طے کریگا۔ یہ وہ شان ہے جو ایک وزیر کی بادشاہ کے لیے ہوتی ہے۔

غلط تربیت کے افسوسناک نتائج

مضر جراثیم سے حفاظت کی ضرورت

بچوں کو ابتدائی زندگی سے مہلک جراثیم سے محفوظ رکھنا انتہائی اہم فرض ہے موجودہ زمانہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اوسر بچہ ذرا سن شعور کو پہنچا اور اُسے بغیر دینیات کی تعلیم دلائے ہوئے اسکول یا کالج میں بھیجا گیا وہاں کے معلمین جو اپنے دماغوں میں مذہب کے خلاف خیالات لیے ہوئے ہوتے ہیں بچوں پر شروع ہی سے اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئینی قواعد کی بنا پر وہ کھلم کھلا اپنے خیالات کی تبلیغ کا مدرسہ کے اندر حق نہ پائیں مگر اُن کے قلبی جذبات اور دماغی خیالات کا اثر اُن کے اقوال و افعال میں پیدا ہو جانا ضروری ہے کسی مذہبی حکم کو سنتے پر خندہ زیر لب، کسی مذہبی پیشوا کے تذکرہ میں یہ الفاظ کہ "لوگ ایسا خیال کرتے ہیں" یہ وہ معمولی باتیں ہیں جو نہ معلوم کتنے طلاب کے ذہن کو متاثر بنا دیتی ہیں۔ پھر طالب علم اپنے ابتدائی دور میں تقریباً اپنے معلمین کو معصوم سمجھتا ہے۔ وہ اُن کی ہر بات کو سر آنکھوں پر رکھنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے

بن جاؤ۔ کمسن بچہ کا دل مثل خالی زمین کے ہے کہ جو چیز اُس میں بوئی جائے اُس کو وہ قبول کر لیتا ہے۔ لہذا میں نے چاہا کہ تمھیں تعلیم دیدوں قبل اس کے کہ تمھارا دل سخت ہو اور تمھاری عقل دوسری چیزوں سے متاثر ہو

بے شک ایسے باپ، چچا یا دوسرے بزرگ انتہائی درجہ مورد اعتراض ہیں جو اپنے متعلق بچوں کو اجنبی آغوش میں اور مسمیت آمیز ہوا میں بغیر کسی حفاظت کے بھیجدیتے ہیں یہ لوگ بعد میں خود پشیمان ہوں گے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان بچوں کے دل میں بڑے ہونے کے بعد اُن کا کوئی احترام نہیں رہا، وہ انھیں بیوقوف سمجھنے لگے اور اُن پر مضحکہ کرنے لگے یہ باتیں کبھی نہ ہوتیں اگر وہ پہلے ہی اُن کو صحیح تعلیمات سے روشناس کر دیتے بہت ممکن ہے کہ یہ لڑکے بھی جب کبھی اُن کے قوائے عقلیہ بیدار ہوں اور آنکھیں کھلیں تو ان بزرگوں کو دل ہی دل میں نفرین کریں کہ انھوں نے ہمارے ساتھ صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا۔

حدیث میں ہے:۔ قال رسول اللہؐ یلزم الوالدین من العقوق لولدھما ما یلزم الولد لھما من عقوقھما "رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ والدین اپنی اولاد کے حقوق کے لحاظ سے اسی طرح عاق ہوتے ہیں جس طرح اولاد اپنے والدین کے حقوق ادا نہ کرنے میں"

بات یہ ہے کہ "عاق" کے معنی تو نافرمان کے ہیں۔ باپ کی اطاعت

تسبقكم اليهم المرجئة " اپنے بچوں کو اپنے روایات و معتقدات کی تعلیم دینے میں جلدی کرو قبل اس کے کہ مرجئہ فرقہ کے تعلیمات ان کی طرف سبقت کریں "

جناب امیرؑ کا ارشاد ہے۔ علموا صبیانکم من علمنا ما ینفعهم الله به لا تغلب علیهم المرجئة برأیها " اپنے بچوں کو تعلیم دو ہمارے علم سے وہ جس سے انکو فائدہ ہو سکے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرجئہ کے خیالات ان پر غالب ہو جائیں "

امیرالمومنینؑ نے اپنے فرزند امام حسنؑ کے لیے جو وصیت نامہ تحریر فرمایا ہے جو تمام زندگی کے شعبوں کے لیے ہدایات کا ایک مکمل مجموعہ ہے اس کی تمہید میں حضرت نے ہمیں ایک دائمی درس دیتے ہوئے یہ ارشاد کیا ہے جس سے ظاہر ہیں مخاطب امام حسنؑ ہیں مگر حقیقتہ اس میں ایک عمومی تعلیم مدنظر ہے۔ فرماتے ہیں فبادرت بوصیتی لخصال۔ " میں نے تمہیں اس وصیت کے پہنچانے میں جلدی سے کام لیا۔ چند وجہوں سے منها ان تعجل بی اجلی " پہلے تو یہ کہ کہیں میری زندگی کی مدت نہ ختم ہو جائے " موت کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں :- وان یسبقنی الیک بعض غلبة الهوی وفتن الدنیا فتکون کالصعب النفور وانما قلب الحدث کالارض الخالیة ما القی فیها من شئ قبلته فبادرتک بالادب قبل ان یقسو قلبک ویشتغل لبک - " اور یہ کہ کہیں تم پر پہلے ہی کچھ غلط خیالات اور دنیا کے ہنگامی اثرات کا غلبہ ہو جائے جس سے تم ایک سخت اور بھڑکنے والے مرکب کی طرح

ہونا چاہیے جیسے ایک کالج کا معلم طالب علموں کے لیے کہ اُس کو اتنے دن
میں تعلیم سے غرض ہے اور کچھ نہیں۔ بچوں کی تربیت میں تعلیمی سختی کے ساتھ
مشفقانہ محبت کے مظاہرات کی بھی ضرورت ہے اور شریعت جو ایک
فطری زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے وہ اس کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ وہ یہ
نہیں چاہتی کہ آپ اپنی اولاد کے سامنے تیوریوں پر بل ڈالے رہیے
اور ہمیشہ اُن سے ڈانٹ ہی کر بات کیجیے بلکہ بموقع اظہار محبت بھی
کیجیے اور یہ وہ چیز ہے جس میں شخصی وقار، متانت، شائستگی کے حدود بھی
ختم ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو پیار کرنا۔ ملاطفت سے کام لینا ایک طرح کی عبادت
ہے رسول اللہؐ کی حدیث ہے:۔ من قبّل ولدہ کتب اللہ لہ حسنۃ،
"جو اپنے بچہ کو پیار کرتا ہے خدا ایک نیکی اُس کے نامۂ عمل میں تحریر فرماتا ہے"
رسالتمآب سے بڑھ کر عالم میں کس کی عظمت ہوگی۔ مگر آپ خود بچوں کے
ساتھ جو طرز عمل اختیار فرماتے تھے اُس کے تاریخ و حدیث دونوں گواہ
ہیں بعض انانیت پسند اور متکبر اشخاص اُس وقت بھی اس پر اعتراض کرتے
تھے اور بہت سے لوگ اس وقت بھی دبی زبان سے کہتے ہیں کہ یہ
چیزیں عظمت کے خلاف ہیں مگر یہ لوگ عظمت نفس کا صحیح معیار نہیں سمجھتے
ہر چیز کا ایک محل ہوتا ہے اور کبھی موقع ہوتا ہے کہ انسان باختیار خود
اپنی عظمت کے درجہ سے نیچے اترے۔ بچوں کے ساتھ وقار و تمکنت کو قائم

خدانے اولاد پر واجب کی ہے اس لیے اگر وہ اُن کی اطاعت نہ کرے تو
نافرمان ہے۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں باپ نے اپنی اولاد کو عاق
کردیا اس کے کوئی معنی نہیں ہیں اگر وہ نافرمان ہے تو عاق ہے۔ چاہے یہ
باپ کہے کہ میں نے عاق کردیا اور اگر وہ اطاعت گزار ہے تو باپ لاکھ کسی
کے کہنے سُننے سے اُس کو عاق کرنا چاہے وہ عاق نہیں ہوگا۔ پھر اسی طرح
خدانے جو حقوق اولاد کی تعلیم و تربیت کے باپ پر عائد کیے ہیں اگر وہ اُن
کو ادا نہ کرے تو وہ بھی نافرمان ہے اس لیے "عاق" کے مفہوم میں داخل ہے

تربیت کے صحیح و مناسب اصول

اولاد کی تربیت بڑی دشوار اور نازک چیز ہے۔ معمولی معمولی
بداخلاقیاں اولاد کے مزاج اخلاقی کے خراب ہونے کا باعث ہوسکتی ہیں
امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں۔ اذا وعدتم الصبیان ففوا لھم۔
"جب بچوں سے کوئی وعدہ کرو تو اُسے پورا کرو۔"
اگر والدین نے وعدہ خلافیاں کیں تو بچوں کے دماغ پر یہ اثر پڑ سکتا
ہے کہ جھوٹ بولنا یا وعدہ خلافی کرنا کوئی بُرا کام نہیں ہے۔ اس لیے وہ
اپنی آئندہ زندگی میں اس جرم کی کوئی اہمیت نہیں سمجھیں گے۔
بے شک باپ کی تعلیم و تربیت اپنی اولاد کے لیے اُس قدر خشک نہیں

تھا چنانچہ جناب تاج العلماء نے تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے والد ماجد جناب سلطان العلماء طاب ثراہ ہم کو بچپنے سے خاص طور پر مردوں کی کھال کھینچی صورتیں دیکھنے کی عادت ڈالتے تھے اور کسی جگہ کچھ ڈاکو مارے گئے اور ان کے سر وہاں سے بھیجے گئے (کیونکہ اُس زمانہ میں محکمۂ فوجداری اور دیوانی سب سلطان العلماء کے اختیار میں تھا) تو وہ سر ایک روز تک ہمارے پلنگ کے قریب رکھے رہے یہ سب اسی لیے تھا کہ خوف دل سے نکلے اور بچہ میں ایسے مناظر کے دیکھنے سے رعب و دہشت نہ پیدا ہو

تحصیل علم کی اہمیت

—— (۱) ——

علم کے شرعی حدود

تعلیم و تربیت انسان کی زندگی کے لئے لازمی چیز ہے اور اسلام نے علم کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ضرورت ہے کہ علم کے شرعی حدود پر تبصرہ کر دیا جائے، حدیث میں ہے:۔ العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے)

اس میں عام طور پر "ومسلمۃ" کا جزو حدیث کے آخر میں زبان زد خلق ہے وہ بالکل الحاقی ہے۔ اصل حدیث میں اس کا وجود نہیں ہے۔

رکھنا اصول انسانیت کے خلاف ہے۔

روایت میں ہے کہ کان رسول اللہ یقبل الحسن والحسین وعندہ الاقرع بن حابس ان لی عشرۃ من الولد ما قبلت احدا منھم فقال رسول اللہ من لا یرحم لا یرحم "رسالتمآب امام حسن و امام حسین اپنے دونوں نواسوں کو پیار کر رہے تھے، اقرع بن حابس نے (یہ عرب کے رؤساء میں سے تھا) کہا کہ میرے تو دس فرزند ہیں میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کے دل میں شفقت و مہربانی نہ ہو وہ خود قابل مہربانی نہیں ہے"

بچوں کے ساتھ یہ طریقہ بھی اختیار کرنا غلط ہے کہ شروع سے ہر بات میں اُن کو ڈرایا جائے اور خوف و دہشت دلائی جائے۔ "ہوا"، اور "جوجو" اور "بی شادی" وغیرہ کے ناموں سے خواہ مخواہ ڈرانا بالکل اصول تربیت کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ طریقہ کہ بچوں کو تنہا مقام پر جانے نہ دیا جائے مُردوں سے الگ ہٹایا جائے۔ مُردہ کی صورت نہ دیکھنے دی جائے یہ سب طریقے صحیح نہیں ہیں ایسے لوگ اپنے بچوں کو اُن کی آئندہ زندگی میں مشکلات کے مقابلہ کے لیے تیار نہیں کرتے بلکہ اُن کے نفس میں کمزوری پیدا کرتے ہیں۔ یہ چیز عرب میں نہیں تھی اس لیے احادیث میں اُس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بے شک آپ کے یہاں کے علماء اور رہنمایانِ دین کو اس کا احساس

دوسرے کو معلوم نہیں ہیں۔ اگر یہی جاننا صرف معیارِ علم ہو تو پھر جاہل کا وجود ہی باقی نہیں رہتا اور اس صورت میں یہ کہنا کہ عالم اور غیر عالم مساوی نہیں ہیں ایک بے معنی بات ہے کیونکہ غیر عالم کی صنف تو عنقا ہے جس کا وجود ہی نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علم کا یہ وسیع اور عام مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کوئی اصطلاحی مفہوم قرار دیا گیا ہے یا اس کی کوئی خاص صنف مراد ہے

اب ہم کو ضرورت ہے کہ ہم اس اصطلاحی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں یا اس صنف خاص کو دریافت کریں جو واقعی مقصود ہے۔

اس کے لیے جب ہم عقل سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاننا انسان کے لئے قابل مدح ہے جو کارآمد حیثیت رکھتا ہو۔

لیکن "کارآمد" کی تعیین ہر انسان کے نقطۂ نظر سے بدل جاتی ہے۔ ایک کسان اس کو کارآمد سمجھے گا جو اس کے شعبہ سے متعلق ہے۔ ایک طبیب اسے کارآمد سمجھے گا جو اس کے مطلب کی چیز ہے اور چونکہ یہاں نقطۂ نظر کی صحت و عدم صحت سے بحث نہیں ہے اس لیے یہ بھی کہوں کہ ایک مغنی یعنی گانیوالا اس چیز کو کارآمد کہے گا جو اس کے مذاق سے تعلق رکھتی ہو۔ اور جب اس کا معیار یہ ہے تو شارع اسی چیز کو علم سمجھے گا جو اس کے نقطۂ نظر سے کارآمد ہو۔

اب دیکھیے کہ شارع کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ انسان کی اعتقادی و عملی

اس کے ساتھ قرآن مجید میں ہے کہ لا یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ۔ " ہرگز برابر نہیں ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ کہ جو علم نہیں رکھتے ۔

بعض لوگ اس قسم کے آیات و احادیث کو لے کر یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اس میں کسی علم خاص کی قید نہیں ہے لہذا ہر علم کا حاصل کرنا مطلوب شرع ہوگا اور انسان کا فرض مذہبی قرار پائے گا ۔

کیا حقیقتہً یہ استدلال درست ہے ؟

علم کے معنے لغت میں دانستن یعنی جاننے ہی کے ہیں لیکن کیا ہر چیز کا جاننا ہر شخص کے لیے سبب فضیلت ہے ؟ اگر ایسا ہو تو دنیا میں عالم اور جاہل کی تفریق ہی بیکار ہے کیونکہ ہر انسان کو اپنے شعبہ زندگی میں کچھ خاص معلومات ہوتے ہیں جو دوسروں کو نہیں ہیں ۔

ایک جنگل میں بسر کرنے والا فقیر جنگل کی بہت سی چیزوں کا علم رکھتا ہے جو بڑے فلاسفہ اور حکماء کو نہیں معلوم اور ایک دریائی سفر کرنے والا کشتی ران دریا اور اس کے جزائر کے متعلق بہت سے معلومات رکھتا ہے ایک کاشتکار زمین کے بونے ، جوتنے کے اسرار جانتا ہے ۔ ایک لوہار لوہے کے خواص و کیفیات کے متعلق علم رکھتا ہے اور ہر شخص اپنے خاندان اپنے آباؤ اجداد اور حالات اپنے گھر کے متعلق وہ بہت سی باتیں جانتا ہے جو کسی

نہ ہوسکیں لیکن چونکہ مختلف ادیان و مذاہب کے اعتراضات کو دور کرنا اور ناواقف افراد کو صحیح مسائل سے واقف بنانا ایسے افراد کے وجود پر موقوف ہے اس لیے ایک جماعت کا ہر زمانہ میں رہنا ضروری ہے جو علم کے اس درجہ پر فائز ہو اس لیے اس درجہ پر علم کی تحصیل کرنا واجب کفائی ہے یعنی سب پر فرض ہے لیکن جب ایک یا چند افراد ایسے پیدا ہو جائیں جو اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں تو پھر دوسروں سے وجوب ساقط ہو جائے گا۔

اسی طرح دوسرے بعض علوم جن پر نظم زندگی موقوف ہے جیسے علم طب چونکہ عام نظام اسباب کی بنا پر امراض کے دفعیہ کا ذریعہ علاج میں منحصر ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے افراد موجود رہیں جو انسان کی صحت جسمانی کی نگرانی کر سکیں۔

یوں ہی غذا اور لباس اور سکونت وغیرہ کے ضروریات کے لیے وہ صنعتیں جن سے کہ یہ ضروریات پورے ہوتے ہیں بقدر ضرورت کفائی حیثیت سے واجب ہیں۔

اس کے بعد وہ علوم جن سے مقصود کسی طرح خلق خدا کو جائز فائدہ پہونچانا ہو لیکن وہ ضروریات زندگی میں داخل نہ ہوں تو وہ مستحب قرار پائیں گے یعنی جب اس قصد سے انجام دیئے جائیں کہ اُن سے خلق کو فائدہ حاصل ہو تو اُن پر ثواب بھی عطا ہوگا۔

آراستگی اور تکمیل لیکن اس آراستگی کے درجے ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے جو ہر انسان کے لیے ضروری ہے اور اُس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اُس سے متعلق علم بھی واجب ہونا چاہیے اور ایک وہ درجہ ہے جس تک پہنچنا ممدوح و مستحسن ہے اُس سے متعلق علم بھی ایسا ہی ہوگا اور بعض امور وہ ہیں جو خود انسان کے لیے جواز کی حد میں ہیں، نہ اُن کے فعل کو کوئی خاص ترجیح ہے نہ ترک کو، ان کا علم بھی اس حیثیت سے جائز و مباح کی حیثیت رکھتا ہوگا۔ وہ نہ واجب ہوگا اور نہ مستحب۔

اب دیکھیے وہ جز جو ہر انسان کے لیے ضروری ہے وہ کیا ہے؟ وہ اصول دین کا اجمالی دلیل کے ساتھ اعتقاد حاصل ہونا اور اعمال و افعال میں واجبات کا پابند اور محرمات کا تارک ہونا یہ وہ کم از کم درجہ ہے جو ہر انسان سے مطلوب ہے اور کوئی شخص اُس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لیے یہ مقدار علم کی واجب عینی ہوگی یعنی ہر ہر متنفس کا افراد انسان میں سے بلوغ و عقل کے ساتھ یہ فرض ہوگا کہ وہ مسائل اعتقادیہ کو دلیل اجمالی کے ساتھ اور واجبات و محرمات کے شرعی احکام کو جاننا ہو اور ان کی معرفت حاصل کرے۔

اس کے بعد اصول عقائد کی تفصیلی واقفیت حاصل کرنا بسط و تشریح کے ساتھ، اور مسائل دینیہ کو نظر و استدلال کے ساتھ جاننا جس کا نام ہے اجتہاد یہ ہر انسان پر فرض عین نہیں ہے۔ ورنہ پھر دنیا کی دوسری ضرورتیں پوری

دیکھیے یہاں لغوی حیثیت کا لحاظ کیا گیا ہی جو "علم" کا اطلاق اس پر کیا گیا لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں العلم ثلثة آیة محکمة او سنة قائمة او فریضة عادلة علم تو بس تین ہیں (یہ علم کے اصطلاحی معنی ہیں جو شرعی نقطۂ نظر سے بیان کیے گئے ہیں)

ایک محکم آیات، دوسرے غیر منسوخ احادیث، تیسرے احکام واجبہ فرماتے ہیں وما عدا ذالک فضل۔ "اس کے سوا جو کچھ ہے وہ پھر فاضل چیز ہے"

اور اگر علم ایسا ہو جس سے مضرت پہونچنے کا اندیشہ ہے یا اُس کا معصیت سے تعلق ہی تو وہ حرام ہوگا جیسے علم موسیقی، وہ بھی اس بنا پر کہ علم اُس کا موقوف علیہ ہے۔ ورنہ اُن مسائل کو لفظی حیثیت سے سُننا یا جاننا حرام نہیں ہے علم سحر اس کا حاصل کرنا بھی حرام ہی مگر یہ کہ ردّ سحر کے لیے ہو۔ تو اُس وقت میں جائز ہوگا۔ تیسرے کتب ضلال یعنے ادیان باطلہ کی کتابوں کا خرید کرنا محفوظ کرنا۔ مطالعہ کرنا اور نشر واشاعت کرنا، یہ سب ممنوع ہی جب تک اس کے ساتھ ردّ وابطال کا قصد نہ ہو، اگر یہ قصد ہو تو جائز ہوگا بلکہ کسی حد تک واجب ہوگا تاکہ اُن شبہات واعتراضات کا دفعیہ ہوسکے اور حمایت حق کا فرض انجام پذیر ہو۔

باقی رہے ایسے علم جن پہ کوئی اس طرح کا مقصد مرتب نہیں ہے مثلاً فلاں ملک سے فلاں ملک کا فاصلہ کتنا ہے؟ وہاں کی مردم شماری کتنی ہے؟ وہاں کی پیداوار کیا ہے؟ وہاں کی اقتصادی حالت کیسی ہے؟ وہاں کا نظام سلطنت کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یا یہ کہ آج سے اتنے صدی پہلے کون بادشاہ تھا؟ اُس کے دورِ حکومت کے اہم خصوصیات کیا تھے؟ اُس کے زمانہ میں حدودِ سلطنت کتنے تھے؟ اس کے زمانہ میں کون سے انقلابات ہوئے اور کیا کیا اہم واقعات رونما ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کا علم حاصل کرنا جائز و مباح کے حدود میں آئے گا یعنی انسان اپنے فاضل اوقات زندگی میں ان باتوں کو بھی جان لے تو کوئی مضائقہ نہیں یہی وہ چیز ہے جس کو رسالتمآبؐ نے فرمایا اس وقت جب آپ مسجد میں تشریف لائے اور ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص کے گرد لوگوں کا مجمع ہے۔ حضرتؐ نے پوچھا یہ کون ہے۔ لوگوں نے کہا "یہ علامہ ہے"

آپؐ نے فرمایا کہ وما العلامۃ "یہ علامہ کیا چیز ہے"؟

لوگوں نے کہا یہ انساب عرب اور تواریخ اور عرب کی لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا یہ ایسا علم ہے کہ نہ اس سے فائدہ پہنچتا ہے نہ نقصان"

وابستہ ہیں اور جن میں کسی طرح مرد اُس کے ساتھ تبادلہ نہیں کر سکتا تو پھر مردوں کے لیے بھی کچھ فرائض مخصوص ہونا چاہئیں جن میں وہ عورتوں کو شرکت کی دعوت نہ دیں۔

یہ بھی عورت کی طبیعت کا ایک کمزور پہلو ہے کہ وہ مرد کی باتوں میں آجاتی ہے جس طرح مردوں نے اُس کو رکھا اُسی کو اُس نے اپنے لیے بہتر سمجھا اور آج جبکہ مرد ہی "آزادی آزادی" پکار رہے ہیں اور یہ صدا بلند کر رہے ہیں کہ عورتوں کو میدان ترقی میں باہر آنا چاہئے تو اسے بھی عورتیں سمجھ رہی ہیں کہ یہ ہماری خیر خواہی ہے۔ اور ہمارے لیے یہی مناسب ہے، حالانکہ وہ دیکھیں تو اس میں صاف مردوں کی خودغرضی نمایاں ہوگی۔ معلوم ہوگا کہ مرد مشکلات زندگی کے پورا کرنے سے ہمت ہار چکا اور وہ عورت کو صرف اپنی مدد کے لیے بلا رہا ہے۔ حالانکہ اس سے عورت کو خود کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ اُس کی "نسائیت" کو انتہائی نقصان ہوگا۔

مرد اور عورت کے تشکیل جسمانی اور اُن کے طبعی نظام زندگانی ہی سے اُن کا مختلف المقصد ہونا بالکل نمایاں ہے۔

پھر جب یہ اختلاف اپنے مقام پر قائم ہے اور مٹ نہیں سکتا تو خواہ مخواہ اُن کو کھینچ کر مرد کے پہلو میں لانے سے فائدہ کیا ہے۔

عورت بہرحال عورت ہے اور اُس کے لیے صحیح تعلیم وہی ہوگی جو اُس کو ایک

تعلیم نسواں

علم کا معیار یہ قرار پایا کہ جو کارآمد علم ہو وہ مستحسن ہے مگر کارآمد ہونا ہر شے کے لیئے اُس کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی بہ مقصد کسی شے کا ہو اور جو اُس کا مخصوص عمل ہو اُس کی حیثیت سے مفید ہو تو وہ کارآمد کہا جائے گا اور اگر اُس حیثیت سے مفید نہیں ہے تو بے کار ہے

قدرت نے نوع انسانی کو دو صنفوں پر منقسم کیا ہے۔ مرد اور عورت ان کے خواص فطری مختلف، ضروریات زندگی مختلف، فرائض و اعمال مختلف، اس لیے کیسے ہو سکتا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ان کو ایک ہی صف میں جگہ دیدی جائے اور دونوں کے لیئے ایک ہی طرح کی تعلیم کو کارآمد سمجھا جائے بے شک عورت کو ترقی حاصل کرنا چاہیئے جس طرح مردوں کو ترقی کرنا چاہیئے۔ لیکن مرد کو مرد رہ کے ترقی کرنا لازم ہے اور عورت کو عورت رہ کے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عرض کروں کہ تعلیم مرد کو وہ ہونا چاہیئے جس سے وہ کامل مرد بن جائے اور عورت کو وہ تعلیم جس سے وہ کامل عورت بنے۔

یہ خواہش کہ عورتوں کو میدان عمل میں بالکل مردوں کے دوش بدوش آنا چاہیئے اُس وقت صحیح ہو سکتی تھی جب مرد اُن فرائض و اعمال میں عورت کے ساتھ شریک ہونے پر تیار ہو جاتا جو عورت سے متعلق ہیں لیکن جبکہ فطرت نے عورت کے لیے کچھ مخصوص فرائض قرار دیئے ہیں جو بالکل اُسی کے ساتھ

کرنا ہی جو اُس کے ضروریات سے متعلق ہیں۔

اسی بنا پر حدیث ہیں وارد ہوا ہے۔ "علموهن الغزل والمعاطنه ولا تعلموهن الكتابة" اُنھیں کاتنے اور سینے کی تعلیم دو اور اُنھیں لکھنا پڑھنا اور تحریر کی تعلیم نہ دو"

ظاہر ہیں اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہی کہ کتابت کا سیکھنا عورت کے لیے ممنوع ہی اس لیے بعض علما بھی فتوے دیتے ہیں کہ کتابت اُس کے لیے مکروہ ہے مگر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہی۔

جس طرح امر یعنی کسی شے کی طلب وجوب یا استحباب کا پتہ دیتی ہی مگر اُس وقت کہ جب اس سے پہلے نہی نہ ہو یا توہم ممانعت کا نہ ہو لیکن اگر پہلے کسی امر کی ممانعت ہوئی ہو اور پھر یہ کہا جائے کہ "اُس کام کو کرو" تو اس سے صرف اجازت مقصود ہوتی ہی کہ وہ حکم اب برطرف ہو گیا یا کسی شے کے متعلق اس توہم کا موقع ہو کہ وہ ممنوع ہے اور پھر اُس کا حکم دیا جائے تو اُس سے مطلب یہ ہوگا کہ اُس توہم ممانعت کا دفعیہ کیا جائے اسی طرح اگر کسی شے کے حکم وجوبی یا استحبابی کے بعد اُس سے منع وارد ہو تو وہ حرمت و کراہت کی دلیل نہ ہوگی بلکہ اُس سے مقصود یہ ہوگا کہ اس کا حکم اب نہیں ہے یا کسی شے کے متعلق استحباب و مطلوبیت کا شبہہ ہو اور اُس کے متعلق نہی وارد ہو تو اس سے

ترقی یافتہ عورت بنا دے۔ تعلیم بے شک ضروری ہے لیکن وہ اس کے لحاظ سے ہونا چاہیئے۔

جہاں تک اقتصادی مسائل کا تعلق ہے مرد اور عورت دونوں مشترک ہیں اسی طرح فرائض الٰہیہ جس طرح مردوں کے لیے ہیں اسی طرح عورتوں کے لیے۔ لہذا ان چیزوں کا علم حاصل ہونا جس طرح مردوں کے لیے ضروری ہے اسی طرح عورتوں کے لیئے بھی۔

بے شک احکام شرعیہ میں ممکن ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہوں جن کا تعلق عورتوں ہی سے ہے مردوں سے نہیں جیسے خاص خاص مسائل طہارت، یا جن کا تعلق مردوں کے ساتھ ہے عورتوں کے ساتھ نہیں جیسے احکام جہاد اس بنا پر کہ جہاد عورتوں سے ساقط ہے۔ ایسے احکام کے ان سب کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جس کی ضرورتوں سے اُن احکام کا تعلق ہے اُسی صنف کو اُس کا علم بھی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کے آگے علم کے وہ درجے جو نظام دنیا کے لحاظ سے ضروری ہیں اُن میں تفریق پیدا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ مرد کے ضروریات عورت سے مختلف ہیں اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان داخلی اور خارجی حدود عمل کی تقسیم کردی ہے۔ طلب معیشت اور جدوجہد مرد کا کام ہے اور انتظام خانہ داری عورت سے تعلق ہے اس لیئے عورت کے لیئے مقدم اُن چیزوں کا حاصل

مردوں کے دوش بدوش تعلیم حاصل کرنا۔

آج تعلیم نسوان کے مبلغین کی طرف سے مثال میں پیش کیا جاتا ہے سیدۂ عالم کو کہ آپ کا علمی پایہ کتنا بلند تھا اور جناب زینب کے متعلق امام نے فرمایا عالمۃ غیر معلمۃ لیکن اس مسئلہ پر اصلا غور نہیں کیا جاتا کہ سیدۂ عالم کے ذرائع معلومات کیا تھے۔ اسکول اور کالج تو بہت دور ہے دنیا کی تاریخ سے یہ تک ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ سیدۂ عالم کبھی مسجد میں اپنے پدر بزرگوار کے موعظہ میں جاکر شریک ہوئی ہوں۔

یہ نکات روایت سُنی ہے کہ جب امام حسن اور امام حسین مسجد سے آتے تھے تو سیدہ اپنے بچوں سے اکثر دریافت کرلیتی تھیں کہ بابا نے موعظہ میں کیا بیان فرمایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سیدہ کو شوق تھا ان معلومات کے حاصل کرنے کا اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ کو سیدہ کی خاطر انتہائی عزیز تھی مگر پھر کچھ پابندی تھی جو سیدہ نے مسجد میں جانے کی خواہش کی اور نہ رسول نے سیدہ کو اس کی اجازت دی سیدۂ عالم نے ہمیشہ کے لیے صنف اناث کے واسطے مثال قائم کردی کہ اگر وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مرد تعلیم یافتہ ہوں اور وہ خود اپنی عورتوں کو گھر کے اندر تعلیم دیں

اُس مطلومیت کی نفی مقصود ہو گی اور بس۔

اب دیکھیے کہ چونکہ مردوں کے لیے کتابت حاصل کرنے کی تاکید ہے اور ظاہری طور پر اس خیال کی کافی گنجائش ہے کہ عورتوں کے واسطے بھی کتابت حاصل کرنے کا حکم ہو گا۔ نیز غزل و خیاطت کا اُن کے لیے پہلے حکم دیا گیا ہے لہٰذا اس "لا تعلموھن الکتابۃ" "انھیں کتابت کی تعلیم نہ دو" کے معنی صرف اتنے ہوں گے کہ ان کے لیے کتابت کی تعلیم کا حکم اُس طرح نہیں ہے جس طرح کاتنے اور سینے پرونے کا۔ یا مردوں کے لیے جس طرح اس کی تاکید ہے۔ اُس طرح عورتوں کے لیے نہیں ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ اُن کے لیے حرام یا مکروہ ہے۔ عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے۔

علاوہ ضروری اعتقادات اور مسائل کے اس حد تک اُن کو دوسرے معلومات حاصل ہو جانا بہتر ہیں جو نظام زندگی میں مفید ہوں جیسے اصول حفظان صحت وغیرہ پھر اگر تمام ضروری باتوں کے پورا کرنے کے بعد اُن کے پاس وقت فاضل ہو تو دوسرے علوم کے حاصل کرنے میں بھی کوئی روک ٹوک نہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کے نسوانی خصوصیات محفوظ رہیں۔

اس کی اجازت کسی طرح صحیح نہیں کہ وہ اسکولوں اور کالجوں میں جا کر

کہ وہ یہ رائے کیوں رکھتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے دماغ نے یہی فیصلہ کیا ہو
مگر مجھے اُن سے شکایت ہے اس امر کی کہ وہ شریعت اسلام کے ہدایات کو
اپنے موافق قرار دینا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ لیکن آپ اس کو نہ
مانتے ہوں یہ آپ کا فعل ہے مگر یہ نہ کہئے کہ شریعت بھی ہمارے ہی موافق ہے

والدین اگر بہ شدت مصر ہیں تو انھیں اپنی لڑکیوں کو اخلاقی تربیت
کے ساتھ ضروری تعلیم بھی ضرور دینا چاہیے مگر اس کا خیال رہے کہ وہ اُن کے
مزاج فطری کے خراب کرنے کا ذریعہ نہ ہو اور اُن کی شرم و حیا کا سرمایہ
جو اُن کا اعلیٰ ترین زیور ہے کسی طرح برباد نہ ہونے پائے

عبادت کی ابتدائی مشق

(اور)

نماز کی تاکید

جس طرح بچوں کو تعلیم کا حکم دیا گیا ہے اور اخلاقی تربیت کی ضرورت
پہ زور دیا گیا ہے اسی طرح انھیں عبادت و طاعات کی عادت ڈالنے کی
بھی تاکید ہے۔

چھ یا سات برس کی عمر سے نماز پڑھنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ اس میں
جتنا زمانہ گزرتا جائے اور بلوغ کی منزل قریب آتی جائے اتنی زیادہ

اس بات بڑے اور چھوٹے کا سوال بھی کوئی چیز نہیں۔ اگر موقع ہو تو ماں اپنے بیٹے سے علمی فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ شرعی پردہ عورتوں کے لیے برقع اوڑھ کر گھر سے باہر نکلنے کا مانع نہیں اگر معلوم ہونا چاہیے کہ ضرورت کے لحاظ جو اس کے حدود جائز سمجھے ہوں لیکن مطلوب اولین شرع کا عورتوں کے لیے گھروں کے اندر ہی رہنا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عورتوں کے واسطے فرائض شرعیہ میں استثنا نہ کیا جاتا۔

نماز جمعہ اس صورت میں کہ جب وجوب عینی کی صورت رکھتی ہو، مرد کے لیے واجب، عورتوں پر سے وجوب ساقط۔

نماز جماعت کی فضیلت مرد کے لیے ثابت۔ عورتوں کے لیے نہیں۔

مسجد کی فضیلت، مرد کے لیے اس کے درجے بلند ہوتے ہیں کثرت اجتماع کے لحاظ سے، اس لیے گھر سے زیادہ ثواب مسجد میں اور مسجد محلہ سے زیادہ ثواب مسجد جامع میں، کیونکہ اجتماع وہاں زیادہ ہوتا ہے مگر عورت کے لیے یہ حکم کہ خارج مسجد یعنی گھر کے باہر نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب گھر کے اندر کا اور صحن سے زیادہ ثواب اندر کے دالان یا کوٹھری کا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرع کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ مجھے ان لوگوں سے تعلیم نسواں کے حامی ہیں یا پردہ کے مخالف ہیں اس کی شکایت نہیں ہے

لیے ثابت ہے اور جب روزہ کی طاقت ہو تو روزہ رکھنے کا حکم ہے "

گذشتہ روایت میں راوی کے سوال میں اور اس حدیث میں امام کے جواب میں "وجوب" کا لفظ ہے جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ وہ واجب ہے مگر کلمات ائمہ کے تلاش و جستجو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجوب۔ تحریم، استحباب، کراہت اور اباحت کے الفاظ اصطلاحی طور پر موجودہ معانی میں علم فقہ کی مدوین کے ساتھ فقہا کے درمیان قرار پائے ہیں اس کے پہلے قرآن و حدیث میں زیادہ تر یہ لغوی معنی کی حیثیت سے استعمال ہوتے تھے۔ اس لئے واجب کی تعبیر مستحب سے اور مستحب کی تعبیر واجب سے، اسی طرح حرام و مکروہ کے الفاظ میں ایک کا دوسرے میں استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ قرائن مقام اور ادلۂ خارجیہ سے وابستہ ہے کہ اصطلاحی حیثیت سے وجوب یا استحباب کا پتہ چلے۔

چونکہ متواتر احادیث اس امر کے ثبوت میں موجود ہیں کہ بچہ جب تک بالغ نہ ہو اُس وقت تک تکالیف شرعیہ اُس سے متعلق نہیں ہوتے اور بلوغ کی حد بھی مقرر کردی گئی ہے کہ وہ پندرہ برس ہے اس لیے ان احادیث میں مراد استحباب ہے اگرچہ اس کو کہیں وجوب کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ کی حدیث میں ہے:۔ انّا نامر صبیاننا بالصلوٰۃ اذا کانوا بنی خمس سنین فمروا صبیانکم بالصلوٰۃ اذا کانوا بنی سبع سنین۔

تشدد و ناگواری کی ضرورت ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے آپ سے دریافت کیا گیا فی کم یؤخذ الصبی بالصلوٰۃ "کتنی وہ عمر ہے جس میں بچّے کو نماز کا پابند بنانا چاہیے" حضرت نے فرمایا۔ فیما بین سبع سنین و ست سنین۔

"سات اور چھ برس کے درمیان ہے" اس "درمیان" کے معنی وہی ہیں جنھیں میں نے اس کے پہلے تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں واضح کیا ہے کہ درحقیقت شارع نے اس مقام پر تقیدی پابندی سے نہیں کام لیا ہے بلکہ ایک تخمینہ بتلایا ہے کہ تقریباً اسی عمر میں بچہ عموماً سمجھنے اور سیکھنے کے لائق ہو جاتا ہے۔

محمد بن مسلم کی روایت سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ الصبی متٰی یصلّی "بچے کے بارے میں امام سے دریافت کیا کہ اُسے کب نماز پڑھنا چاہیے۔ فرمایا اذا عقل الصلوٰۃ "جب وہ نماز کو سمجھنے لگے۔ پوچھا متٰی یعقل الصلوٰۃ و یجب علیہ "کب نماز کو سمجھنے لگتا ہے اور نماز اس کے لیے ثابت ہوتی ہے" حضرت نے فرمایا "چھ برس کے سن میں"

معلوم ہوتا ہے کہ معیار اس کا یہ ہے کہ بچہ میں عقل و شعور پیدا ہو جائے۔ امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے:۔

اذا اتی علی الصبی ست سنین وجب علیہ الصلوٰۃ و اذا اطاق الصوم وجب علیہ الصیام "جب بچہ کا چھ برس کا سن ہو تو نماز کا حکم اس کے

ظاہر ہے کہ مشق کرانے کا تعلق ماں باپ سے ہے لہذا اُن ہی کو اس کا ثواب بھی ہو۔

میری نظر میں اس مسئلہ میں کلیۃً طور پر کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ بچہ کو اتنا احساس ابھی پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ نماز کو ایک خداوندی حکم کے قصد سے انجام دے لیکن والدین عبادت کا شوق پیدا کرنے کے لیے اُس کو نماز پڑھنے کی ہدایت کریں یا وہ ایک شریر اور بدطبیعت لڑکا ہے کہ وہ باوجود یہ سمجھنے کے کہ یہ ایک حکم خدا ہے اور اچھی بات ہے لیکن کبھی اگر والدین اُس کو مجبور نہ کریں تو وہ نماز نہ پڑھے گا۔ وہ نماز پڑھتا ہے صرف ماں باپ کی زبردستی سے اور اُن کے ڈر کے مارے اور اس لیے وہ اکثر ماں باپ کو دھوکہ بھی دے لیتا ہے اور نماز کو اُڑا دیتا ہے، ایسی صورت میں بے شک یہ عمل عبادت نہیں ہے اس لیے کہ قصد قربۃً جو عبادت کا حقیقی جوہر ہے وہ اُس میں موجود نہیں، ایسا عمل اگر کوئی بالغ و عاقل انسان کرے تو وہ بھی قابل قبول نہ ہوگا اس عمل کے ادا کرنے کا سہرا صرف ماں باپ کے سر ہے جو عادت ڈالنے کے لیے بچے کو اُس کے ادا کرنے پر مجبور کرتے ہیں وہ یقیناً اُس کی آئندہ زندگی کے لیے مفید ہے اس لیے کہ اس ذریعہ سے

ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم لوگ (اہلبیت معصومینؑ) اپنے بچوں کو نماز پڑھنے پر مامور کرتے ہیں جب وہ پانچ برس کے ہوں لہذا تم لوگ (کم از کم) اپنے بچوں کو نماز کے لیے مامور کرو جب وہ سات برس کے ہوں۔"

یہ اس اصول پر مبنی ہے کہ جو رہنمایان مذہب ہوں اُن کو ضرورت ہے کہ مذہبی احکام کی طرف توجہ اُس سے زیادہ کریں جتنا کہ عام لوگوں کو وہ دعوت دیتے ہیں۔

اس حدیث کا لب و لہجہ استحباب کو صاف بتلاتا ہے اس لیے کہ واجبات میں شرع کی جانب سے تعبدی پابندی ہوتی ہے اور وہ سب کے لیے عمومیت رکھتی ہے۔

یہ تفریق اور اس طرح اپنے یہاں کی مثال پیش کر کے دعوت عمل دینا استحباب کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

اب اختلاف ہے علماء میں کہ یہ بچہ جو نماز روزے وغیرہ ادا کرتا ہے یہ عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اُس کو ثواب بھی اُن اعمال کا حاصل ہوگا یا صرف تمرینی حیثیت رکھتے ہیں یعنی مشق کے لیے انجام دیئے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ عام طور سے مشہور ہو گیا ہے کہ بچہ جو نماز پڑھتا ہے اُس کا ثواب اُسے نہیں ہوتا بلکہ والدین کو ہوتا ہے۔

اس کی بنیاد اسی امر پر ہے کہ جب وہ کوئی عبادت نہیں اور صرف مشق ہے تو یہ

برکات سے محروم کرنا اور اس کے اجر و ثواب سے بے بہرہ رکھنا بالکل تفضل و احسان کے خلاف ہے
بچوں کے مرفوع القلم ہونے کے نصوص ہرگز اس کو نہیں بتلاتے بے شک اس صورت میں اگر ماں باپ ترغیب عبادت و اطاعت کرتے ہیں اور اُن کی ترغیب و تحریص سے بچہ میں جذبۂ طاعت و عمل پیدا ہوتا ہے تو اس کے ثواب کا جس طرح بچہ کو بحیثیت عمل حاصل ہونے کے استحقاق ہے اُسی طرح ان ماں باپ کو بحیثیت محرک عمل حاصل ہونا چاہیئے جس طرح اگر کسی سمجھدار اور سن رسیدہ شخص کو دعوت عبادت و اطاعت دی جائے تو عامل کو ثواب عمل کا ہے اور محرک کو تحریک عمل کا۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ واجبات کے دائرے سے بچے مستثنیٰ ہیں لیکن استحباب کا درجہ اُن کے لیے ثابت ہے اور اس لیے مستحبات جو عام اشخاص کے لیے ہیں وہ بچوں کے لیے بھی ہیں اور ان سے بچوں کے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لڑکیوں کی تربیت کے خاص اصول

بچوں کی تعلیم و تربیت میں جس اصول کے ماتحت اُن کو عبادات و اطاعات کی عادت ڈالنے کا حکم ہے اُس اصول پر لڑکیوں کی تربیت

ممکن ہے ایک وقت میں اُس کو احساس فرض بھی پیدا ہو جائے اور وہ صحیح طریقہ سے عبادت کو بجالانے لگے، اس لیے اس وقت اس نماز و روزہ کے ادا کرنے کا ثواب ان ہی ماں باپ کو ملنا چاہیے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بچہ میں خود ذوق عبادت ہو اور اُسے شوق ہے کہ وہ اس عمل کو جو خدا کی جانب سے اُس کے بندوں پر عائد ہے بجالائے یہاں تک کہ ممکن ہے کسی وقت والدین روکتے بھی ہوں کہ روزہ نہ رکھو یا نماز نہ پڑھو تو وہ بچہ نہیں مانتا اور اُسے اضطراب پیدا ہوتا ہے کہ کسی طرح وہ اُس عبادت کو انجام دے لے۔ ایسے بچے یقیناً جو اعمال بجالائیں اُن کے ثواب کا اُنہیں استحقاق ہے۔ بلوغ کا زمانہ مقرر کیا جانا ایک تفضل ہے خداوند عالم کی جانب سے جس کی بنا پر پندرہ برس تک انسان فرائض الٰہیہ سے سبکدوش رکھا گیا ہے ورنہ عقلی حیثیت سے اکثر بچے اس کے بہت پہلے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اُن پر پابندیاں عائد کی جا سکیں، پندرہ برس تک آزاد رکھنا صرف احسان ہے اور کچھ نہیں لیکن تفضل و احسان اُسی وقت تک تفضل ہے جب تک وہ کسی حیثیت سے خلاف تفضل نہ ہو۔ احسان کا تقاضا صرف یہ ہے کہ بلوغ کے پہلے انسان کو گناہوں کی سزا کا مستحق قرار دیا جائے لیکن اگر وہ عبادت و اطاعت کی حقیقت کا صحیح احساس رکھتے ہیں اور اُس کے برکات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اُنہیں ان

بلوغ یا بقول آپ کے جوانی کا زمانہ آنے ہی اُس کو ایک دم پابند بنانا اور پردہ کے اندر مقید کرنا اُس کی فطرت کے اوپر ایک ایسا زبردست دباؤ ہوگا جسے وہ مشکل سے برداشت کر سکے گی اگر واقعی آپ کو اُسے آئندہ زمانہ میں پردہ کرانا ہے تو اس کے لیے آپ کو پہلے سے اُس کی طبیعت کو عادی کرنا چاہیے ۔ اس کی صورت یہی ہے کہ اُس وقت کا ذکر نہیں ، جب اُس میں سمجھنے کی کچھ صلاحیت ہی نہیں ہوتی لیکن جب سے اُس میں امتیاز و شعور پیدا ہو اُسی وقت سے اُسے یہ احساس پیدا کرانا ہے کہ وہ ”لڑکی“ ہے ۔ اور لڑکی کی طرح اُسے رہنا چاہیے اس میں ایک حکیمانہ تدریج قائم کرنا چاہیے اور جب وہ چھ سات برس کی ہو تو اُسے مکمل پردہ کا عادی بنا دینا چاہیے اس طرح نہیں کہ اُس کی طبیعت کے لئے یہ ناگوار ہو بلکہ اس طرح کہ وہ خود سمجھے کہ میرے لئے موزوں و مناسب یہی طریقہ ہے یوں سمجھیے کہ اُس کی طبیعت کو اس سانچہ میں ڈھالنا چاہیے کہ اُسے دوقی ہی ”سیر تماشا“ کا پیدا نہ ہو ۔ اجنبی لڑکوں کے ساتھ سمجھدار لڑکیوں کا کھیلنے دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے ۔ وہ بچپنے کے ساتھ کھیلنے ہی کا اُنس و محبت ایک وقت میں دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے جس پر والدین کو شرمساری و پشیمانی کا موقع حاصل ہوگا ۔

اکثر بچوں سے جو کہانیاں کہی جاتی ہیں اُن میں عشق و محبت کے تذکرے

ہیں کچھ باتوں پر خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جو اُن کی اخلاقی اصلاح کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ لڑکیوں کو اُن کے آئندہ دور میں ایک خاص طرح کی زندگی بسر کرنا ہے اور شریعت اسلامی کے احکام کے ماتحت اُن کے لیے پردہ فرض و لازم ہوگا اس لیے اُن کو کمسنی کے زمانہ سے پردہ کی پابندی کے لیے تیار کیا جائے۔ اُن گھرانوں کا ذکر ہیں اور اُن افراد سے بحث نہیں جن کے یہاں اب عورتوں کے لیے پردہ کوئی چیز ہی نہیں رہا ہے مگر وہ شریف گھرانے جہاں اب بھی پردہ کی کوئی اہمیت باقی ہے اُن کو اس امر کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ لڑکیوں کو کھیلنے کے دور میں اُس طرح آزاد نہ رکھا جائے۔ جس طرح لڑکے آزاد رہتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکیوں کو بلوغ کے زمانہ تک باہر نکلنے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت رہتی ہے بلکہ کبھی شرعی سن بلوغ کا یعنی ۹ برس پورے بھی ہو جاتے ہیں مگر اُسے ابھی بچہ سمجھا جاتا ہے اور پردہ کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا ہے ان لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ لڑکی ایک انسانی مخلوق ہے اور کمزور۔ اُس کی طبیعت میں متاثر ہونے کا کافی مادّہ موجود ہے اگر بچپنے میں اُسے تفریح گاہوں میں جانے کا ذوق، باغات کی سیر کا شوق، اور تماشا گاہ عالم کے مناظر دیکھنے کا لطف حاصل ہو گیا تو

چیز ہے جس میں کچھ مخصوص لطف مضمر ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگتی ہے اور اس کے بعد اگر اس میں تاخیر ہونے لگتی ہے تو اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہو سکتا۔

ایک صاف سادہ مخلوق جس میں تشنگی موجود نہیں، اسے صرف خوش آیند تذکروں سے تشنہ بنایا جاتا ہے۔ پھر جس وقت اس کو سچی پیاس ہوگی تو آپ اس کے حصول مقصد میں تاخیر بھی کریں گے۔ یقیناً اس میں جو کچھ بھی برے نتائج پیدا ہو جائیں وہ کم ہیں۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے بالواسطہ شادی کی آرزو کا استحکام ہوتا ہے حالانکہ اُن کے قرار دینے کا مقصد نیک تھا مگر طریقہ حصول اس کا میرے نزدیک اچھا نہیں اختیار کیا گیا۔

اکثر گھرانوں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لیے ممنوع ہیں۔ جیسے مسّی لگانا، اُلٹے بال بنانا۔ عطر لگانا، ہار پھول پہننا۔ پائنچے دار پائجامہ پہننا وغیرہ وغیرہ جب لڑکی ان باتوں کا ارادہ کرتی ہے تو اُسے یہ کہکر روک دیا جاتا ہے کہ تمھاری شادی نہیں ہوئی ہے۔ تم کو یہ باتیں نہیں کرنا چاہئیں اس کا نتیجہ ہے کہ لڑکی کو شادی کی حسرت پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ یہ کہ وہ شادی کی اصل حقیقت سے واقف ہے بلکہ اس لیئے کہ شادی ہو

ہوتے ہیں یہ چیزیں لڑکیوں کے لیئے خاص طور سے مضر ہے ۔

اُن سے جو کہانیاں کہی جاتی ہیں اُن میں اگر سچائی - دیانتداری، امانت وغیرہ کے سبق حاصل ہوتے ہوں تو بہت اچھا ہے اور نہیں تو کم سے کم ایسی باتیں تو نہ ہونا چاہیئے جو اُن کے دماغ کو نامناسب خیالات کا مرکز قرار دے سکتی ہیں - میں تو لڑکیوں سے ایسی کہانیاں کہنے کا بھی حامی نہیں ہوں جن میں عفت و پارسائی کا تذکرہ ہو - جیسے بادشاہ اور قاضی اور اُس کی زوجہ کی حکایت جو اکثر قدیم اخلاق کی کتابوں میں درج ہے اور شعرا ر نے اُسے نظم بھی کیا ہے کیونکہ اس طرح کے حکایات میں بھی صنفی تعلقات کی اس طرح یاددہانی ضرور موجود ہے جس سے میری رائے میں ابتدائے عمر میں لڑکیوں کو بالکل خالی الذہن ہی رہنا بہتر ہے، چہ جائیکہ وہ حکایتیں جن میں ناجائز تعلقات اور ہجر و وصل کے افسانوں کا بیان ہو۔

میری نظر میں لڑکیوں کی تربیت کا جو معیار ہے وہ تو اتنا دشوار ہے کہ غالباً موجودہ نظام معاشرت میں اُس پر عمل ہونا بالکل غیر ممکن ہے ۔

لڑکی کے سامنے زیادہ شادی کا ذکر کرنا جیسے اکثر دلچسپی کے طور پر اُس کے گھونگھٹ نکال دیتے ہیں، کہتے ہیں لو دلھن بیٹھی ہے یا اُس کو شرمانے کے لیے خواہ مخواہ اُس کے سامنے شادی کا نام لیتے ہیں، یہ چیزیں وہ ہیں جو اُس کے ذہن میں یہ تصور پیدا کرتی ہیں کہ شادی ایک خاص

پر رنگ آ جائیگا اور اس طرح یہ خواہ مخواہ شادی کے دن تک کی منتظر بن جائے گی۔

یہ کچھ برا نہ تھا اگر آپ اس معاملہ میں شرع کے حکم پہ چلتے۔ وہاں یہ حکم ہے کہ لڑکی کی شادی بہت جلدی کر دو۔ یہاں تک کہ اگر اس کا بلوغ ہی شوہر کے گھر میں ہو تو بہت اچھا ہے مگر یہاں تو لڑکیاں اکثر بیس ۲۰ پچیس ۲۵ برس تک بیٹھا رکھی جاتی ہیں اس لئے کہ آپ کی طبیعت کے مطابق شوہر نہیں ملتا اور اکثر لڑکیوں کی "بہار زندگی" اسی طرح "خزاں" ہو جاتی ہے اور وہ حقیقی طور پر زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔ اس طرز عمل کے ساتھ پھر وہ طریقۂ تربیت تو انتہائی مہلک اور ضرررساں ہے۔ اور کیا معلوم کہ جو ناگوار واقعات پیش آتے ہیں اُن میں کہاں کہاں والدین ہی کا طرز عمل سبب ہوتا ہے جو خرابیاں ہو کر پیش آتی ہیں۔

زمانۂ بلوغ

(یا)

انسانی ذمہ داری کا ہنگام

بچہ کی صحیح تعلیم و تربیت ہو چکی، اُسے ضروری تعلیم دیدی گئی

تو ہمیں بھی یہ آرائش کرنے کی اجازت ملے۔ میں نے کہا کہ اس رسم کا مقصد نیک تھا، درحقیقت اس رسم کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ آرائش حسن خود طالب اظہار ہے۔ اگر لڑکی آراستہ و پیراستہ ہوگی تو خود بخود اس کے ذہن میں اس قسم کا خیال پیدا ہوگا کہ اس کا دیکھنے والا ہونا چاہیئے لیکن اگر وہ بچی کھچی رہے آرائش سے علیحدہ رہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہی نہیں ہوگا لیکن اس مقصد کے لیئے ضرورت تھی ایسے طریقوں کی کہ لڑکی کے دل میں شوق آرائش پیدا ہی نہ ہو اصول تربیت کے تحت میں اس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ جب لڑکی ذرا سمجھدار ہو تو اس کی ماں بڑی بہنیں اور دوسری بزرگ عورتیں جو گھر میں رہتی ہیں وہ خود اپنی آرائش کو کم کردیں، تاکہ لڑکی بھی اسی ماحول میں پرورش پائے یہ نہیں کہ جب کسی تقریب میں جانے لگے تو جتنی گھر کی عورتیں ہیں سب نے بہترین طریقہ سے اپنے تئیں آراستہ کیا اور رونق حسن کے جتنے اسباب ہیں سب مہیا کرلیئے صرف ایک یہ "گنہگار" بن بیاہی لڑکی رہ گئی جو سب سے علیحدہ وضع رکھتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ اُسی طرح یہ بھی آراستہ ہو تو یہ کہدیا جاتا ہے کہ نہیں۔ خبردار تمھاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ تم کو حق نہیں اب نہ پوچھیئے کہ اُس کے دل پر کیا گزرے گی اور اُسے کس طرح اپنی دوسری ساتھی عورتوں

خیالات دماغ میں راسخ نہیں ہوتے اور ۔ ان کا عمل شعور [illegible] اتنا ہوتا ہے کہ وہ عبادت کو عبادت سمجھ کے بجا لائیں اس لئے اس طرح گناہ اُن پر نہیں ہیں، اسی طرح ثواب بھی اُن کے لیے نہیں ہے ۔ لیکن اس کے بعد کچھ مدت میں وہ زمانہ آجاتا ہے جب وہ عبادت کو سمجھ کر عبادت بجا لاسکتے ہیں یہ ابتدائے تعلیم کے دن یعنی چھ یا سات برس کی عمر اور وقت بلوغ یعنی پندرہ برس کے درمیان کی ایک منزل ہے ۔ اس لیے اس کے لئے ۱۲ برس کی عمر تخمینہ کے طور پر بتلائی گئی ۔

اس زمانۂ نابالغی میں جس طرح واجبات و محرمات کی ذمہ داری سے وہ سبکدوش ہیں ۔ اس لیے کہ اُن کی عقل ابھی کامل نہیں ہوئی ہے ۔ اس کے علاوہ اُن کے اموال اور ملکیتوں میں اُن کے تصرفات بھی نافذ نہیں ہیں ۔ ملکیت کا حصول تو بلوغ پر موقوف نہیں ہے شیر خوار بچہ، بلکہ جب وہ حمل کی حالت میں تھا اُس کے لیے بھی ملکیت کا حصول ممکن تھا مثلاً اگر کوئی اُس کا عزیز قریب مر جائے جس کی میراث کا اُسے حق حاصل ہو تو اُس کا حصہ الگ کیا جائے گا ۔ جب وہ زندہ پیدا ہو تو اُس کے لیے وہ میراث قرار دی جائے گی مگر تصرف املاک میں اُس وقت تک صحیح نہیں جب تک حد بلوغ تک نہ پہنچ جائیں ۔ یہ بھی اُن ہی کے مفاد کی خاطر ہے اس لیے کہ ناسمجھی اور بھولے پن سے نہ معلوم کون سا ایسا تصرف کر دیں جو

اُس کے اخلاق کی اصلاح کی گئی، اُس کو عبادت و اطاعت کا ذوق و شوق پیدا کیا گیا اور لڑکیوں کو مناسب طریقہ پر اُن کے آئین زندگی کا پابند بنا دیا گیا مگر ابھی تک نابالغی کا زمانہ ہے۔ اس وقت میں ایک طرف وہ تکالیف سے مستثنیٰ ہیں یعنی گناہ اُن کے نامۂ عمل میں نہیں لکھے جاتے اگر یہ ثواب کے متعلق میں نے کہا کہ اگر اُن میں خود ذوقِ عبادت و اطاعت پیدا ہو گیا ہے تو انھیں استحقاق حاصل ہے۔ ثواب و عذاب کے مسئلہ میں اس تفریق کا مجھے ایک شاہد احادیث میں بھی مل گیا۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ان اولاد المسلمین موسومون عند اللہ شافع مشفع فاذا بلغوا اثنتی عشرۃ سنۃ کتبت لھم الحسنات فاذا بلغوا الحلم کتبت علیھم السیئات "مسلمانوں کی اولاد خدا کے یہاں نامزد ہے۔ وہ اپنے والدین کی شفاعت کرنے والے ہیں اور وہ شفیع قرار دیئے گئے ہیں اس کے بعد جب ۱۲ برس کی عمر ہو تو اُن کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جب بالغ ہوں تو گناہ لکھے جاتے ہیں" اس میں جو عمر مقرر کی گئی ہے وہ ویسی ہی جیسے تعلیم و تادیب کے لیے سات برس کی جس کو میں نے کہا کہ یقینی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک تخمینہ ہے اسی طرح یہ زمانہ مطلب یہ ہے کہ شروع میں چھ سات برس کے سن میں جب سے کہ تعلیم و تربیت اور عبادتوں کی عادت ڈالنے کا حکم ہوا اُس وقت اُن میں زیادہ تر وہ

"طلاق اُسی کا ہاتھ میں ہے کہ جو ہاتھ پکڑے گا" اس لیے باپ دادا بھی اپنی ولایت سے اگر بچہ کا عقد کر دیں تو بھر وہ اُسے طلاق نہیں دے سکیں گے۔ نابالغی کے زمانہ ہی میں باپ کے اُٹھ جانے سے انسان یتیم ہوتا ہے۔ بلوغ کے بعد یتیمی کی حالت ختم ہو جاتی ہے اور پھر اُسے یتیم نہیں کہا جا سکتا۔

بلوغ کے لیے شرع نے دو حیثیتوں سے حد مقرر کی ہے۔ ایک عمر کے لحاظ سے یعنی لڑکے کو پندرہ برس پورے ہو جائیں اور لڑکی کو ۹ برس۔ دوسرے حالات کے لحاظ سے مثلاً مرد اور عورت دونوں میں وہ صورتیں پیدا ہوں جن سے غسل واجب ہوتا ہے۔

یہ قابلِ غور بات ہے کہ بلوغ حکم شرعی ہے جس کا نتیجہ ہے تکالیف شرعیہ کا متوجہ ہو جانا۔ اور تصرفات کا نافذ ہونا اور یتیمی کا ختم ہونا اس لیے کہ "احکام شرعیہ" وجوب، حرمت، استحباب، کراہت، اباحت ہی کو نہیں کہتے، یہ تو "احکام تکلیفیہ" ہیں ان کے علاوہ شرعی احکام بہت ہیں جیسے طہارت نجاست، زوجیت، ملکیت، حرمت وغیرہ وغیرہ۔ ان کو احکام وضعیہ کہتے ہیں یہ بھی شرع ہی کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہا جائے کہ بلوغ بھی اسی طرح کا ایک حکم شرعی ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس کا اختیار بالکل شرع کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے اس حکم کا محل قرار دے سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ

اُن کے حق میں مضر ہے جس پر کہ بعد میں انھیں سخت تاسف ملنا پڑے گا علاوہ مالی تصرفات کے دوسرے اُن کے معاملات جیسے نکاح وغیرہ بھی معتبر نہیں قرار دیئے گئے بے شک ان تمام باتوں کے لیے اُن کے واسطے ولی مقرر کر دیئے گئے وہ جو عام اصول فطرت کی بنا پر ان کے مفاد کی نگہداشت خود اُن سے زیادہ کر سکتے ہیں۔ یعنی باپ اور دادا، اس بارے میں ان کو نو یہ تاکید ہے کہ وہ بچہ کے مفاد کا خیال رکھیں۔ مگر اُن کو اس معاملہ میں اُن کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک طرح کی حکومت دی گئی ہے یعنی وہ اپنی صوابدید سے جو کام اس بچہ کے لیے کر دیں اُس کے منسوخ کرنے کا اس کو بلوغ کے بعد بھی حق نہیں ہے ان دونوں میں سے ہر ایک مستقل طور پر ولی ہے اگر دونوں موجود ہیں اور ایسا اتفاق ہو کہ دونوں متضاد تصرف واقع کریں۔ مثلاً ایک نے اس کی کسی املاک کو ایک کے ہاتھ فروخت کیا اور نا واقفیت کی وجہ سے دوسرے نے کسی اور کے ہاتھ تو جس کا تصرف پہلے واقع ہوا ہو وہ نافذ سمجھا جائے گا، دوسرا تصرف بیکار ثابت ہوگا اور اگر اتفاقی طور پر ایک ساتھ یہ تصرفات ہوں تو دادا کا حکم باپ پر مقدم ہے کیونکہ وہ اس کے لیے بھی واجب الاطاعت ہے۔

بے شک طلاق کا مسئلہ اس درجہ شریعت نے نازک قرار دیا ہے کہ اُس کا حق شوہر کے سوا اور کسی کو نہیں ہے۔ الطلاق بید من اخذ بالساق

یکساں ہوں تو ایک حکم سب کے لیے جاری کیا جائے اور اگر حالات ان کے
مختلف ہوں تو ہر ایک کے لیے اس کے لحاظ سے حکم جدا اور سب کے حکم
جدا جدا ہوں لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ایک عام قانون نافذ کرنا
مقصود ہے جس میں افراد و اشخاص کی خصوصیتوں کا کوئی سوال ہی نہیں ہے
اس صورت میں اگر ان کے حالات باہم اختلاف رکھتے ہیں تو ان سب کی
اجتماعی حیثیت کو سامنے رکھ کر ایک عالمی معیار یا اوسط نکالا جائے گا۔
اور اس کے مطابق حکم نافذ کیا جائے گا اس میں پھر یہ سوال ہی پیدا
نہیں ہو سکتا کہ کسی فرد میں یہ صورت پہلے ہو جاتی ہے اور کسی میں بعد۔
مثال کے طور پر گورنمنٹ کی جانب سے زمینداری وغیرہ کے تعلقہ میں بائیس ۲۲
برس کی عمر معین کی گئی ہے ظاہر ہے کہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی معیار اور
اصول بھی پیش نظر ضرور رکھا۔ یعنی ۲۲ کی تعداد سے کوئی خاص محبت نہیں تھی
نہ اس عدد سے کوئی برکت حاصل کرنا مقصود تھی۔ مگر یہ یقینی ہے کہ وہ
معیار و اصول ہر ایک شخص کے لیے ٹھیک ٹھیک بائیس ہی برس میں حاصل
نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی کے لیے پہلے ہوتا ہے کسی کے لیے بعد۔ لیکن پھر بھی
قانونی حیثیت سے عموم پیدا کرنے کے لیے ایک عمر کا سب کے لیے معین کرنا
ضروری سمجھا گیا۔ اسی طرح ساردا ایکٹ میں شادی کے لیے چودہ ۱۴ اور
۱۸ برس کی عمر معین کی گئی ہے وہ چاہے ہمارے نزدیک غلط ہو لیکن پھر بھی

وہ ایک امر واقعی ہے جس پر شریعت کی طرف سے احکام مرتب ہوئے ہیں۔ اور اُن حالات کا پیدا ہونا اُس کے حصول کی علامت ہے۔ اس وقت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ شرع کی جانب سے اس کے لیے دو حدیں مقرر کیا جانا کیونکر درست ہیں جبکہ وہ دونوں بالکل لازم اور ملزوم نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے جُدا بھی ہو جاتی ہیں اس کے علاوہ آب و ہوا مزاج وغیرہ کے اعتبار سے بچہ کے خصوصیات مختلف ہوتے ہیں، کسی میں چودہ ۱۴ برس کے سن میں وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جو دوسرے میں پندرہ ۱۵ برس کے سن میں ہوتی ہے اور کسی میں سولہ ۱۶ برس کی عمر میں بھی یہ حالت نہیں ہوتی اس صورت میں شارع کی جانب سے سب کے لیے ایک عمر مقرر ہو جانا کہاں تک درست ہے۔

اس کا جواب میں اس طرح پیش کروں گا کہ کوئی حکم جو دیا جاتا ہے اُس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ کوئی شخص خاص مخاطب ہو اور اُس کے خصوصی حالات کی بنا پر اُس کے ذمہ کوئی فرض عائد کیا جائے ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو اُس کے خصوصیات اور انفرادی حالات اُس حکم کا معیار ہوں گے اور وہ بالکل معین حیثیت رکھتے ہوں گے اسی طرح اگر چند اشخاص کی جانب حکم متوجہ کیا جائے مگر ان کی انفرادی خصوصیتوں کے لحاظ کے ساتھ، یقیناً اس صورت میں لازمی ہے کہ اگر اُن کے حالات

نظامِ زندگی میں مذہب کی اہمیت

انسانی زندگی میں عقائد کو بڑی اہمیت حاصل ہے مذہب ہی وہ ہے جو دنیا میں امن وامان کا سبب ہو سکتا ہے اور مختلف جماعتوں میں حقوق وحدود کی تعیین کرتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر انسان بلندی و تفوق کا طالب ہے اور اپنی خواہشوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر انسان کی خواہشیں ہیں لامحدود یہاں تک کہ اگر ایک انسان کو تمام دنیا بھی مل جائے تو وہ آرزو مند ہوگا کہ ایک دنیا دوسری ہو جسے وہ اپنے قبضہ میں لائے مگر دنیا اور اس کے منافع ہیں محدود اس لیے اگر ایک انسان کو سب کچھ وہ دے دیا جائے کہ جس کا وہ طالب ہے تو دوسرے سب کو محروم ہونا پڑے گا اور اگر سب کو اُن کی لامحدود خواہشوں کے حاصل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو تصادم ہوگا اور قوتوں کا تقابل ہوگا جس میں ہر طاقتور کمزور کو فنا کر دینے کی کوشش کرے گا پھر اگر یہ قوت اور کمزوری کوئی مستقل اور دائمی حیثیت رکھتی ہوتی تو اچھا ہوتا کہ ایک دفعہ مقابلہ ہو کر فیصلہ ہو جاتا جو طاقتور ہوتا وہ زندہ رہتا اور جو کمزور ہوتا وہ فنا ہو جاتا مگر یہ دنیا کی طاقت و قوت اور کمزوری ہوا کے جھونکوں اور جھولے کے پینگوں کی طرح

کسی نہ کسی مقررشدہ معیار کی بنا پر رکھی گئی ہے ۔ وہ معیار یقیناً اتنی ہی عمر ہو بالکل منطبق نہیں ہے مگر قانون کا انداز ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں انفرادی اختلافات اثر انداز نہ ہو سکیں ۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ وہ حالات جو اصل میں علامات بلوغ مقرر کیے گئے تھے چونکہ باطنی چیزیں ہیں اور اکثر ایسے ہیں کہ جب تک خود انسان اُن کا اظہار نہ کرے اُس وقت تک اُن کا علم ممکن نہیں ، اگر ان ہی کو معیار بلوغ قرار دیا جاتا تو بیانات دینے میں اشتباہ واقع ہوتا نیز اکثر عوارض کی بنا پر وہ حالات پیدا نہیں ہوتے یا بہت زیادہ عمر میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ اُن کے علاوہ بھی کوئی معیار مقرر کیا جائے جس کا سمجھنا آسان ہو ۔ اس کے لیے عمر قرار دی گئی ۔ اب اگر اُن دوسرے حالات کا علم اس عمر کے پہلے ہی ہو جائے تو وہی ثبوت بلوغ کے لیے کافی ہوں گے اور اگر یہ عمر حاصل ہو گئی تو چاہے وہ حالات پیدا ہوں یا نہ ہوں بلوغ شرعی حاصل ہو جائیگا اور احکام بلوغ مترتب ہونگے

بلوغ کے بعد کی اہم ذمہ داریاں

حد بلوغ تک پہونچنے کے بعد انسان کی ذمہ داریاں بہت ہیں جن کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (ایک) اصول عقائد (دوسرے) عملی فرائض ۔ اس دوسرے شعبہ میں پھر دو قسمیں ہیں ایک حقوق اللہ یعنی انسان کے انفرادی فرائض دوسرے حقوق الناس یعنی اجتماعی فرائض ان پر ترتیب کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے ۔

پاکر آپ نے معاہدہ کے شکنجے میں اُس کو اسیر کرکے اُس کے مقبوضات مال لاوارث کی طرح اپنے دوستوں پہ تقسیم کر دیئے، لیکن جب دشمن نے آخر کی مہلت پاکر اپنی طاقت کو بڑھا کر اپنے سابقہ مقبوضات کا مطالبہ کرتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ساتھ جذبۂ انتقام کی بنا پر اپنے حریفوں کے ساتھ کچھ زیادتی بھی کر رہا ہو۔ تو آپ فریاد کرتے ہیں کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے ہم مظلوم ہیں اور ہمدردی کے مستحق ہیں اور دنیا بھی کہتی ہے کہ ہاں بیشک مظلوم ہیں۔

بات یہ ہے کہ انسان حال کو دیکھتا ہے اور وہی اُس کے دل ودماغ پر اثر ڈالتا ہے اور ماضی و مستقبل چونکہ نگاہ سے اوجھل ہیں اس لیے اُن کا اثر پڑتا نہیں۔

اس وقت جس کی زیادتی ہوگی دنیا کے زود فراموش افراد اسی کو کہیں گے کہ ظالم ہے۔ حالانکہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس ظلم کے اسباب کیا ہیں۔ پھر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے انداز مختلف ہوتے ہیں کوئی تو شمشیر برہنہ ہو کر سامنے آجاتا ہے اور کوئی "دشنہ زیر آستین پنہاں" کیے ہوئے اپنے حریفوں کے سامنے آتا ہے۔ بہرحال مختلف جماعتوں کی خود غرضی اور تفوق و برتری کی خواہش اور اپنے حقوق کا مطالبہ ہمیشہ تصادم اور کشمکش کا باعث رہا ہے اور رہے گا کیونکہ انسانی خیال

منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ایک وقت جو طاقتور رہے وہ دوسرے وقت کمزور اور ایک وقت جو کمزور رہے وہ دوسرے وقت طاقتور رہتا ہے اب جس شخص نے اپنی قوت کے وقت پر دوسرے کمزور پر زیادتی کی وہ اس کمزور کے دل میں رہ جاتی ہے اور وہ موقع کا منتظر رہتا ہے جب اس کو طاقت حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کا بدلا لیتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک توانا و تندرست جوان اپنے راستے میں ایک کمزور اور ناتوان بچے کو دیکھتا اور اسے دھکا دے کر ہٹا دیتا ہے۔

یہ اس وقت ایک بالکل معمولی خبر تھی اور اس کے لیے آسان مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت میں یہ جوان بوڑھا ہوگا اور وہ بچہ جوان ہوگا، اگر اس نے یہ احساس دل میں قائم رکھا کہ میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس شخص نے مجھ پر زیادتی کی تھی تو وہ اپنی قوت کے دور میں اس شخص سے بدلا لینے کی کوشش کرے گا اب ممکن ہے کہ وہ بوڑھا آدمی چیخے چلائے اور فریاد بھی کرے کہ میں مظلوم ہوں یہ جوان آدمی مجھے مارے ڈالتا ہے اور نا واقف یا سادہ لوح افراد اس سے متاثر بھی ہوں مگر حقیقت میں یہ اس کی مظلومیت ایک وقت کے ظالم ہونے کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں اس طرح کی مثالیں پیش ہوتی رہتی ہیں جس وقت حالات آپ کے سازگار رہتے اور طاقت آپ کے ساتھ تو دشمن کو کمزور

خدا ہے جس کو تمام کائنات سے یکساں تعلق حاصل ہے
مذہب ضمیر اور دل پر حکمران ہوتا ہے۔ اور چونکہ دل کی سلطنت تمام اعضائے جسم انسانی پر ہے اس لیے تمام انسان کے افعال و اعمال قبول و رد کے خوف میں انجام پاتے ہیں۔

مذہب سے قطع نظر کرتے کہ ہم کسی طاقتور سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنی طاقت سے فائدہ نہ اٹھائے کیونکہ دنیا کی ہر چیز فائدہ اٹھانے کے لیے ہے اور فائدہ جو کچھ ہے وہ یہی دنیا کا وقتی فائدہ ایک شخص جس کے بازوؤں میں قوت نہیں اور جس کا ساتھ کوئی نہیں، وہ مقابل کمزور ہے اور اس کی پامالی سے ایک بہت بڑے لطف کی امید ہے کس سہارے پر اپنا بچاؤ کر سکے اور کس امید پر اپنے مقصد کے حاصل کرنے سے باز آئے۔

مگر مذہب وہ ہے جو انسان کے جذبۂ اقتدار اور غرور و قوت کو شکست دیتا ہے، وہ انسان کی نگاہ کو بلند کرتا ہے۔ اور اس وقتی و عارضی مفاد کے آگے ایک کامیابی و ناکامی کا تصور پیدا کرتا ہے اور اسی کے سہارے پر ایک طاقتور انسان طاقت کے ناجائز استعمال سے باز رہتا ہے اور کمزور اور ناتوان اشخاص کو سانس لینے کا موقع مل سکتا ہے
مذہب دنیا میں امن و امان اور نظام اجتماعی کے برقرار رہنے

کے مطابق آپ کے حقوق بھی اُس کی تمناؤں کے ساتھ وابستہ ہیں یا جو جس کی آرزو ہے اُسی کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے اور اُس کی تکمیل کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس معیار کے مطابق سب کو اُن کے حقوق ملنا اور سب کو پوری آزادی ہو جانا غیر ممکن ہے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ایک کو کامل آزادی دیدی جائے اور دوسروں کو سب کو مقید کر دیا جائے مگر یہ وہی کر سکتا ہے جس کو اُس ایک کے ساتھ کوئی جانبداری اور رشتہ داری ہو، بہرحال عقل و انصاف کی بارگاہ میں یہ صورت قابل قبول نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ سب کو حصہ رسدی آزادی کی تقسیم ہو اور سب کے حقوق کی کسی بالادست طاقت کی طرف سے تعیین ہو جس کی وجہ سے تصادم کا امکان جاتا رہے مگر یہ تقسیم اور تعیین کرے کون۔ کیونکہ دنیا میں مختلف حیثیتوں کے تفریق قائم ہے اور کوئی شخص بھی ہو اُسے کسی ایک فرد یا جماعت سے زیادہ تعلق اور دوسروں سے کم تعلق ہونا یقینی ہے اور اس لحاظ سے جانبداری کا امکان ہے اور پھر تمام ہماجنوں کے ضروریات و حقوق سے یکساں طور پر کسی کا باخبر ہونا بھی ممکن نہیں ہے اس لیے ضرورت ہے حدود اور حقوق کی تعیین کرنے والی ایک ایسی ہستی ہو جس کو تمام افراد بشر کے ساتھ یکساں تعلق ہو اسی کی طرف سے عائد کردہ قانون سب کے لیے یکساں طور پر قابل عمل ہو سکتا ہے اور وہی قانون کہ جو سب کے لیے حدود آزادی کی تعیین کر دے، اُس کا نام مذہب ہے اور اُس کا نافذ کرنیوالا

اسلامی عقائد کا اثر

افعال و اعمال پر

انسان کے افعال و اعمال اس کی ذہنیت کے ماتحت ہوتے ہیں اور ذہنیت کی تشکیل عقائد و خیالات سے۔ اسلام نے جن عقائد کی تلقین کی ہے وہ سب ایسے ہیں کہ جو انسان کو بلند نگاہ بنانے والے ہیں اور اس کے افعال و اعمال میں بلندی و شائستگی پیدا کرنے کے باعث ہیں۔

توحید

سب سے پہلا تحفہ جو مذہب کی طرف سے عالم انسانیت کے لیے پیش ہوا ہے وہ خدائے واحد کا اقرار ہے۔ اس کی وجہ سے تمام افراد انسانی ایک ہی رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ایک ہی کیفیت میں سمو جاتے ہیں۔

انسانی جماعت میں مختلف حیثیتوں سے تفریق ہے اور اس سبب ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان میں آپس میں محبت نہیں ہوتی اس لیے کہ کسی چیز میں وہ اپنے کو دوسرے کے ساتھ متحد نہیں خیال کرتے لیکن اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں تو سب ایک دوسرے کے ساتھ یگانگی اور اتحاد کا احساس کرنے لگیں۔

دنیا میں طاقتور کمزور پر اس لیے ہاتھ اٹھاتا ہے کہ اپنے سے بالاتر

کا واحد ذمہ دار رہتا۔

یہ اور بات ہے کہ دنیا میں مذہب ہی کے نام پر فتنہ و فساد برپا ہو اور جنگ و جدال قائم ہو مگر مذہب اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا نہ اس کی وجہ سے مذہب فنا کئے جانے کے قابل ہے۔ یہ اپنی نگاہ کا قصور ہو گا کہ انسان نقل اور اصل میں تمیز نہ کر سکے انسان اگر ایمی ٹیشن سے دھوکا کھائے تو یاقوت کو برا نہ کہے بلکہ اپنی نگاہ کی کمزوری کا اقرار کرے۔ اگر ملمع کو اصلی سونا خیال کرے تو سونے کا قصور نہ سمجھے بلکہ اپنی شناخت کی کوتاہی خیال کرے یوں ہی اگر مذہب کے نام سے کسی دام فریب میں مبتلا ہو جائے تو مذہب کا شکوہ نہ کرے اپنی نگاہ و غلط اندازی کوتاہی کا احساس کرے۔

انسان کو چاہیئے کہ سوچے سمجھے اور غور کرے۔ دیکھے کون مذہب حق ہے اور کون باطل، کون آواز جو مذہب کے نام سے بلند کی گئی حقیقت پر مبنی ہے اور کون جعلسازی مکاری اور ابلہ فریبی پر،

اسی لیے مذہب کی تحقیقات کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رکھا گیا ہے اور کسی کے لیے صرف باپ دادا کے راستے کی پابندی اور اُن کے اختیار کیئے ہوئے مسلک کی لاج کو ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے کافی نہیں سمجھا گیا ہے۔

میں تغیر لازم آئے گا۔ یہ استدلال غلط ہے۔ معلومات کے تغیرات علم مثلاً
تغیر ضروری نہیں ہے اور اس لیے ذات الٰہی میں بھی تغیر لازم نہیں
آتا۔ بہر حال مذہب حق کی تعلیم اس سے جداگانہ ہے۔
مذہب کہتا ہے کہ خدا کو ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا علم ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام
نے نہج البلاغہ میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے وہ ایک ایسا انداز ہے
جو دماغوں میں اس حقیقت کو بالکل جاگزیں کر دیتا ہے۔ حقیقت میں تو یہ
ایک جملہ ہے کہ "خدا ہر بات سے واقف ہے" مگر اس کا دل و دماغ پر وہ
اثر نہیں پڑتا جو تجزیہ و تحلیل کے ساتھ معمولی اور انتہائی چھوٹی چیزوں
کی تفصیل کے بیان کے ساتھ پڑتا ہے۔
"الولایۃ کے معاملات" رسالہ میں جو امامیہ مشن سے شائع ہوا ہے
امیر المومنین علیہ السلام کے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ خداوندی علم و اطلاع
کی اس وسعت کے احساس سے انسان کی عملی زندگی پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے
غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ گناہ کے لیے انسان کو فطرتاً ایک خواہش "اخفا"
ہوتی ہے۔ انسان معمولی معمولی آدمیوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ گناہ
کرتے اس کو دیکھ نہ لیں وہ تذکرہ سن لیتا ہے اپنے جرم کا تو دل
دھک سے ہو جاتا ہے اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ یہ ان
لوگوں کا ذکر ہے جنمیں احساس گناہ باقی ہو اور گناہ کو فخریہ انداز

کوئی قوت نہیں کھتا اور کمزور اس لیے شکستہ دل ہو جاتا ہے کہ اپنی حمایت میں کسی کو مددگار نہیں دیکھتا۔

خدائے واحد کا عقیدہ طاقتور کے سرِ غرور کو جھکاتا ہے اور اس کے دل میں ایک غیبی طاقت کا اندیشہ پیدا کرتا ہے اور کمزور کی نگاہ کو اٹھاتا ہے اور اس کے دل میں امید کی لہر پیدا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف طاقتوں میں توازن قائم ہوتا ہے اور زندگی کی کشمکش میں کمزور بھی طاقتور کے ساتھ جدوجہد کے قدم اٹھاتا ہے مضطرب دل کے لیے سکون، ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا، مایوسیوں کے عالم میں دلاسا اگر ملتا ہے تو خدائے واحد پر ایمان سے۔ مادہ پرست انسان کی زندگی ایک ایسی کشتی ہے جس کا کوئی ساحل نہیں مگر خدا پرست انسان کی کشتی کتنی ہی طوفانی ہو اور تھپیڑوں میں گردش لے رہی ہو مگر پھر بھی وہ پُر امید ہے اس لیے کہ اس کشتی کا ایک ساحل ہے اور اس کا ایک ناخدا ہے اور وہ پردۂ غیب کا پوشیدہ خدا ہے۔

علمِ خدا

فلاسفہ اور حکماء نے خدا کے علم کو کلیات کے ساتھ محدود قرار دیا ہے اس لیے کہ جزئیات متغیر ہیں، ان کے علم سے خدا کی ذات

دنیا کے ہر شعبہ میں مکر فریب خیانت دغابازی ایذا رسانی۔ چوری، فسق فجور۔ بدکاری سب نتیجہ ہے اس کا کہ انسان خدا کو اپنے دل سے واقعی طور پر حاضر و ناظر نہیں سمجھتا۔ دنیا والوں کے یہ ذہن نشین ہو جائے کہ خدا حاضر و ناظر ہے تو دنیا امن و امان کا گہوارہ بن جائے اور ہر قسم کی بدعملیوں کا سدباب ہو جائے۔

حکمت و عدالت

"خداوند عالم" کے افعال کیسے ہو سکتے ہیں، اس جگہ ایک طبقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا خیر و شر دونوں کا خالق ہے اور یہ کہ ظلم، ناانصافی غلط بیانی وغیرہ۔ تمام قبائح یعنی بری باتیں اس کے لیے جائز ہیں وہ جو چاہے کرے۔ اس کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خداوند عالم کی ذات کے متعلق ہمارا نقطہ نظر اس درجہ تک محدود رہے گا تو اس کے بعد کی منزلیں اس سے پست ہی ہوتی جائنگی مثل مشہور ہے "وزیرے چنیں شہریارے چناں"

جب خدا اس طرح کا ہے تو اس کا رسولؐ اسی اعتبار سے ہوگا۔ اور جب رسولؐ کا درجہ یہ ہوگا تو اس کے جانشین ایسے ہی ہوں گے اور جب پیشوائوں کا یہ عالم ہوگا تو متبعین کا پوچھنا ہی کیا؟

پرہیز کرتے ہوں خصوصاً ایک انسان اُس شخص سے تو بہت زیادہ اخفا
کی کوشش کرتا ہے کہ جس کا جرم ہو۔ کسی کو ہم بُرا کام کرتے ہوئے اور وہ
آتا ہوا نظر آئے فوراً زبان کو روک لیں گے خاموش ہو جائیں گے
اس غرض سے کہ اُس کو اطلاع نہ ہو، شرط یہ ہے کہ اُس شخص کا کچھ بھی
لحاظ، عظمت اور عزت نگاہ میں ہو پھر جب معمولی احساس کا یہ حال ہو
تو اگر کسی کو یقین ہو اس کا کہ خدا اُس کے اعمال کا حاضر و ناظر ہے۔ ہر وقت
وہ اس کے افعال کا نگران ہے۔ اور اس کی ذرا ذرا سی بات کا اس کو
علم ہے تو کیا ممکن بھی ہے کہ انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرے۔

اسی بنا پر خداوند عالم نے اپنے علم کا تذکرہ قرآن میں اکثر افعال
خلق ہی کے لحاظ سے کیا ہے۔ مثلاً ان اللہ بصیر بما تعملون۔ ان اللہ
بما تعملون بصیر۔ ان اللہ خبیرٌ بما یصنعون۔ ان اللہ علیم بما
یفعلون وغیرہ وغیرہ۔ اور انسان کی خواہش اخفا کو دکھلاتے ہوئے
ارشاد ہوتا ہے۔ یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ
وھو معھم اذ یبیّتون ما لا یرضیٰ من القول وکان اللہ بما یعملون محیطا
"یہ لوگ آدمیوں سے چھپتے پھرتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ
وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ وہ راتوں کو ایسے مشورے کرتے ہیں جو خدا
کو ناپسند ہیں اور خدا اُن کے اعمال سے پورے طور پر باخبر ہے۔"

اور اُس میں طبعی طور پر ان جرموں سے علیحدگی کا خیال پیدا ہوتا ہے

جبر و اختیار

ایک فریق کا عقیدہ ہے کہ انسان جو کچھ کام کرتا ہے وہ خدا کی جانب سے ہیں، انسان نماز پڑھتا ہے تو وہ نہیں پڑھتا بلکہ خدا پڑھواتا ہے اور یہ شراب پیتا ہے تو خود سے نہیں پیتا بلکہ خدا پلواتا ہے انسان مثل ایک بیجان آلہ کے خدا کے ہاتھ میں متحرک ہے اور یہ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کرتا۔

یہ عقیدہ اگر دنیا کے دماغ پر پورا اثر کرے تو دنیا میں کوئی مجرم اپنے جرم کے بعد خجالت محسوس ہی نہ کرے، اور نہ کوئی گنہگار اعتراف گناہ کرے، اصلاح کے دروازے بند ہو جائیں اور تعلیم و تربیت بیکار قرار پائے۔ اس لیے کہ دنیا میں جو کچھ افعال ہوتے ہیں وہ انسان کی جانب سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں بلکہ اس لحاظ سے ایک گنہگار اور مجرم انسان عزت کا مستحق ہے کہ وہ منشاء الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ اور مشیت خداوندی کا عملی مظہر ہے۔

کیا اس طرح نظام زندگی کی عملی اصلاح ہو سکتی ہے اور افراد انسانی کے اخلاق کی تکمیل ممکن ہے۔

جب الوہیت کی منزل "جائز الخطا" ہونے کی سطح پر قائم ہوتی ہے
تو نبیوں کے درجوں میں "عصمت" کا سوال ہی غیر ممکن ہے۔

اس عقیدہ سے بری باتوں کی برائی بالکل شک ہو جاتی ہے اور ظلم
وغیرہ کی اہمیت انسان کو محسوس نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس عقیدہ کے
رکھنے والوں میں بھی ایسے افراد ہوں اور واقعی ہوتے ہیں کہ جو اچھے
اخلاق کے لحاظ سے شائستہ انسان کہے جا سکیں مگر یہ ان کے حسن فطرت
کا نتیجہ ہے، ان کے مذہبی عقیدہ کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے۔ اس کے
برخلاف مذہب حق کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی ذات تمام برائیوں سے
منزہ و مبرا ہے۔ وہ عادل ہے اور حکیم ہے، اس کا ہر فعل خیر ہی ہے
اور شر کا اس کے یہاں گزر نہیں ہے۔ قرآن مجید نے خداوند عالم کے
اوصاف کے تذکرہ میں بہت اس عملی پہلو پر توجہ کی ہے۔ ان اللہ لا
یحب الظالمین - ان اللہ لا یحب المفسدین وغیرہ وغیرہ

پھر جب وہ دوسروں سے ظلم اور فساد وغیرہ کو پسند نہیں کرتا تو اپنی
جانب سے کیونکر پسند کریگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی قدرت محدود
ہے یا وہ عاجز ہے۔ بلکہ وہ اپنے کمال ذاتی اور حکیمانہ رفعت کے لحاظ
سے غیر ممکن ہے کہ ان باتوں کا مرتکب ہو اس سے انسان کے ذہن میں
ان باتوں کی برائی اور قبیح افعال سے نفرت کا احساس راسخ ہوتا

غلت ایدیہم ولعنوا بما قالوا بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشاء "یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔ خود ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے اور یہ مستحق لعنت ہیں اپنے اس قول کی وجہ سے بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔"

بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقہ میں بھی یہ خیال پیدا ہو گیا کہ خدا کے مقررہ فیصلوں میں تبدیلی ناممکن ہے وہ کہتے ہیں کہ فیصلہ کا تبدیل کرنا پشیمانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور پشیمان وہی ہوتا ہے کہ جو نتائج سے بے خبر ہو۔ خدا کے فیصلوں میں تبدیلی کا قائل ہونا اس کے وسعت علم کا انکار کرنا اور اس کو انجام سے ناواقف قرار دینا ہے اس لیے درست نہیں۔ شیعہ فرقہ کے عقیدہ میں خداوند عالم کے احکام مصالح و اسباب کے لحاظ سے ہوتے ہیں اس لیے صورت حال اور اسباب کی تبدیلی کے ساتھ ان احکام میں بھی تبدیلی ہونا چاہیئے اسی کا نام بداء ہے۔ یہ کہنا کہ فیصلہ کی تبدیلی ہمیشہ پشیمانی اور ناعاقبت اندیشی ہی کا نتیجہ ہے۔ درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ قرارداد کسی وقتی مصلحت پر مبنی ہو اگرچہ فیصلہ کرنے والے کو پہلے سے یہ علم ہو کہ آئندہ اس طرح سے تبدیلی واقع ہوگی اس کی مثال یہ ہے کہ آپ کے یہاں ملازم کی تنخواہ کی ایک شرح مقرر ہے اور

ائمۂ معصومین کی تعلیم اور مذہب کا صحیح عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے، اچھے کام بھی وہی کرتا ہے۔ اور بُرے کام بھی وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے۔

بے شک اچھے کاموں میں خدا کی طرف سے امداد ہوتی ہے جس کا نام ہے توفیق مگر اس کی وجہ وہ فعل انسان کے حد اختیار سے خارج نہیں ہوتا۔ اور بُرے کاموں کے لیے اکثر خارجی تحریکات اور شیطان کے وسوسے محرک ہوتے ہیں مگر پھر بھی انسان بے بس نہیں ہوتا۔ اور جزا و سزا سب انسان کے ذاتی افعال کا نتیجہ ہے اور اس لحاظ سے ہر انسان کو اپنے اصلاح عمل کا موقع حاصل ہے اور اُس کا فرض ہے کہ وہ گُم سے اجتناب کرے اور اچھے اعمال کی پابندی اختیار کرے ایسا نہ کرنے کی صورت میں مجرم وہی ہوگا اور اُس کی ذمہ داری کسی دوسرے پر عائد نہ ہوگی۔

بداء

یہود کا عقیدہ تھا کہ خدا جو کچھ مقرر کرنا تھا ازل میں مقرر کر چکا اب وہ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، قرآن مجید میں اس عقیدہ کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا گیا ہے اور اُس کی رد کی گئی ہے کہ قالوا ید اللہ مغلولۃ

ہوتا ہے مگر علم ازلی ہے اُس میں تبدیلی ہرگز نہیں ہے۔
اب دیکھئے کہ اس عقیدہ کا انسان کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہے
ظاہر ہے کہ بیشتر افراد بشر خود غرض ہوتے ہیں یعنی اپنا کوئی فائدہ چاہتے ہیں اور ایسے بلند نظر اشخاص کم ہوتے ہیں جو صرف "مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ" کے اصول پر اعمال بجالائیں۔ اگر انسان یہ سمجھے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اُس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے بہر حال خدا کے جو فیصلے ازل میں ہو چکے ہیں وہ ہو کر رہیں گے تو انسان جد و جہد، کوشش عمل کو بیکار سمجھے گا اور محنت و مشقت کا کوئی فائدہ محسوس کریگا کیونکہ جو کچھ ہونے والا ہے بہر حال ہو گا۔ اس کے کیے سے کچھ نہ ہو گا لیکن اگر انسان یہ سمجھے گا کہ ہمارے افعال و اعمال سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے اور خدا کے فیصلے بھی ہمارے حالات کے لحاظ سے تبدیل ہوتے ہیں تو اُسے احساس پیدا ہو گا کہ ہم اپنے عمل کی کیفیت کو بہتر سے بہتر بنائیں تاکہ ہمیں بہتر نتیجہ حاصل ہو سکے۔

خداوند عالم اپنے بندوں کے لحاظ سے صرف ایک حاکم اور فرمانروا کی حیثیت نہیں رکھتا جس کو زبردستی اپنے حکم کے منوانے سے غرض ہو بلکہ وہ اس کے ساتھ ایک خیر خواہ ناصح اور مشیر کی حیثیت بھی رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے احکام میں ایک طرف آمرانہ حیثیت سے

وہ ساٹھ روپیہ ماہوار ایک یا ملازم آپ کے یہاں آتا ہے ممکن ہے
آپ جانتے ہوں کہ وہ اتنا وفادار اتنا ہنرمند اور باسلیقہ ہے
کہ اس کے خدمات کے صلے میں مجھ کو بعد میں ایک روپیہ ماہوار
کا اضافہ اس کی تنخواہ میں کرنا پڑے گا مگر اس وقت ایسی کوئی وجہ
نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر اپنے عام اصول کو توڑ دیں لہذا آپ
خود اس ملازم کو بھی یہی بتلائیں گے کہ تمہاری تنخواہ ساٹھ روپیہ
ماہوار ہے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہی کہیں گے اور رجسٹر پر بھی
یہی درج کریں گے۔ بے شک جب وہ کوئی ایسی خدمت کرے گا
یا کوئی خاص وفاداری کا ثبوت پیش کریگا تو آپ اس کی تنخواہ
میں اضافہ کر دیں گے اس وقت خود اس سے بھی کہیں گے کہ تمہاری
تنخواہ بڑھا دی گئی اور اپنے رجسٹر کی بھی تبدیلی کرینگے مگر کیا اس کی
وجہ سے آپ کی عاقبت اندیشی اور انجام بینی پر اثر پڑتا ہے ہرگز نہیں
یوں ہی سمجھ لیجئے۔ خداوند عالم کی قرار دادیں مصالح و حکم پر
مبنی ہوتی ہیں وہ قیامت تک کی تبدیل ہونے والی تمام صورتوں کو
ہمیشہ سے جانتا ہے مگر کسی خاص سبب کے ظہور پذیر ہونے کے پہلے
اس کے مطابق قرار دینا حکمت و مصلحت کے خلاف ہے لہذا جیسا وقت
ہوگا ویسی بات ہوگی۔ قرارداد فعل ہے اور علم صفت، فعل تبدیل

اور یہی وہ ہے جس کا نام ہے بداء جس کو ہمارے لیے سرمایہ طعن تشنیع قرار دیا جاتا ہے ملاحظہ ہوں ذیل کے امور:-

(۱) مغفرت خدا گناہوں کو بخشتا ہے۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے دریافت طلب یہ ہے کہ جس وقت گناہ کیا اس وقت یہ شخص مستحق عذاب بنا یا نہیں - اگر نہیں تو بخشش کے کوئی معنی نہیں اور اگر بن گیا تو مغفرت کے بعد وہ حکم بدلا یا نہیں - اگر نہیں تو بخشش کوئی چیز نہیں اور اگر بدلا تو یہی وہ ہے کہ جس کا انکار کیا جا رہا تھا اس عنوان کے تحت میں تمام وہ کثیر التعداد آیات قرآنی پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں مغفرت کا تذکرہ ہے۔

(۲) توبہ بندوں کی توبہ جو سچے دل سے ہو قبول ہوتی ہے یہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے - اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان گناہ کرنے کے بعد عذاب خدا کا مستوجب بن گیا تھا اور توبہ کی وجہ سے کہ جو انسان کا فعل ہے اس قرارداد میں تبدیلی ہو گئی اس وقت یہ اہل نار سے تھا اور اب یہ اہل جنت سے ہے۔

کیا یہ وہی چیز نہیں ہے جسے بداء کہکر مورد اعتراض قرار دیا جاتا ہے

(۳) شفاعت انبیا اور معصومین بلکہ عام مومنین اور بالخصوص حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کیلیے

آخرت کے انعام اور مخالفت پر سزائے اخروی کا پیغام دیتا ہے اور دوسری طرف وہ اُن افعال و اعمال کی افادی حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے اُن کے دنیوی فوائد یا خواص سے بھی مطلع کرتا ہے۔

صدقہ ردِّ بلا کا باعث ہے۔ غریبوں کی خبر گیری کرنا عمر میں اضافہ کا سبب ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ انسان کے لیے ایک بہترین عمل کا محرک ہے۔

فرض کیجیے وہ حضرت عیسٰی کا مشہور واقعہ کہ آپ نے ایک عروس کے متعلق حکم لگایا تھا کہ اس کا کل انتقال ہو جائے گا اور دوسرے دن ایسا نہیں ہوا اور تحقیق پر یہ معلوم ہوا کہ اس نے ایک بھوکے کو سیر کر دیا تھا اس لیے بلا رد ہو گئی اور عمر میں اس کی وسعت ہو گئی یہ واقعہ آپ کے سامنے ہوا ہوتا تو کہا اسی طرح آپ سائلوں کو رد کر دیا کرتے اور غریبوں کی طرف سے منھ پھیر لیا کرتے جیسا اب کرتے ہیں۔

قرآن مجید اور اُس کے آیات کو تدبر کی نگاہ سے دیکھیے اور تعلیمات مذہبی پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ مذہب کے مسلّمہ عقائد و تعلیمات میں بہت سی باتیں وہ ہیں جن کی حقیقی بنیاد یہی چیز ہے کہ خدا کے فیصلے اسباب و مصالح کے لحاظ سے بدلتے ہیں

متعلق یہی حکم لگائے گا اس لیے کہ اس کے کافر ہونے کا تقاضا یہی ہے اس کے بعد وہ ایمان لے آتا ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ زبان پر جاری کرکے دل سے مسلمان ہو جاتا ہے۔ بتائیے اب اس کا کیا حکم ہے؟ یہ کہ جنت کا مستحق ہے اور اگر ابھی دنیا سے سدھار جائے تو بلا حساب داخل بہشت ہو گا۔ دیکھیئے انسانی طرز عمل اور حالات کی تبدیلی سے فیصلہ میں کتنی بڑی تبدیلی ہو گئی۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن شروع سے لے کر آخر تک عقیدہ بدا کی تلقین کرتا ہے کیونکہ وہ کافروں کو ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور اس پر نجات کا وعدہ کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایسا نہ کرو گے تو تم جہنم میں جاؤ گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خداوندی فیصلوں کو انسانی اعمال کے ساتھ وابستہ بناتا ہے اور انسان کے حالات کی تبدیلی سے انھیں قابل تبدیلی قرار دیتا ہے۔ اور افراد انسانی کے اعمال و افعال کی اصلاح اس عقیدہ سے وابستہ ہے۔

بھلا اگر ابو جہل کو معلوم ہو جائے کہ میں لاکھ مسلمان ہوں مگر جو میرے متعلق فیصلہ ہو چکا وہ برقرار رہے گا تو اُسے اسلام لانے کی ضرورت کیا ہے اور اگر ایک گنہگار انسان یہ سمجھ لے

شفاعت کا درجہ تمام مسلمانوں کے نزدیک ثابت ہے۔ یعنی آپ کی سفارش بہت سے گناہ گاروں کی مغفرت کا سبب ہوگی۔ اب بتایئے کہ اس سفارش کے پہلے یہ اشخاص جہنم میں جانے والے تھے یا نہیں، اگر نہیں تو سفارش کی ضرورت نہیں اور اگر تھے تو شفاعت سے فیصلہ بدلا یا نہیں۔

(۴) دعاء قرآن مجید میں دعا کا حکم موجود ہے اور اس کی قبولیت کا وعدہ کیا گیا ہے جمہور مسلمین کا عقیدہ بھی اس کے مطابق ہے مگر کیا اس خیال کے مطابق کہ جو کچھ فیصلہ ہونا تھا ہو چکا۔ اور وہ قابل تبدیلی نہیں ہے۔ دعاء کا کوئی نتیجہ قرار پاتا ہے اور قبولیت دعا کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔

دعا اور اس کی قبولیت سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی افعال کے لحاظ سے مقررہ باتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور اسی کا نام بداء ہے

اس کے علاوہ اگر غور کیا جائے تو کفر کے بعد ایمان لانے سے نجات کا حکم بالکل اسی بنیاد پر مبنی ہے

ایک شخص پہلے کافر تھا، اس کے متعلق حالت کفر میں خداوندی فیصلہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ مخلد فی النار ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہے گا! آپ کسی نبی و رسولؐ سے پوچھیے تو وہ اس کے

باب میں ارباب مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب کے اوصاف کے متعلق زاویۂ نگاہ مختلف ہو گیا ہے۔

بہت سے لوگ انبیاء کے لئے عصمت کو ضروری نہیں سمجھتے اور کسی نہ کسی حد تک گناہ کی اجازت دیتے ہیں خواہ یہ کہ وہ گناہ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہوں مگر صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، خواہ یہ کہ بعد بعثت معصوم ہیں مگر قبل بعثت گنہگار ہونا ممکن ہے، خواہ یہ کہ جان بوجھ کر گناہ نہیں کرتے مگر غلطی یا سہو و نسیان سے ارتکاب ممکن ہے۔ فرقہ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ انبیاء تمام گناہوں سے ہر حال میں معصوم ہیں۔

عقلی استدلال کے لحاظ سے یہ مسئلہ بالکل صاف ہے۔ انبیاء آتے ہیں ہدایت خلق کے لیے لہذا اُن کے ہاتھوں کسی طرح گمراہی خلق کا اندیشہ نہ ہونا چاہیے اور اگر نبی کسی طرح بھی غلطی کا مرتکب ہو تو اُس سے کسی نہ کسی حد تک خلق خدا کے گمراہ ہونے اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا ضرور امکان ہے۔

اب دیکھیے کہ انسان کی عملی زندگی پر اس مسئلہ کا کیا اثر پڑتا ہے یہ بالکل صاف ہے۔ اگر یہ خیال قائم کر لیا جائے کہ انبیاء بھی گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے تو عام افراد کی نظر میں گناہ

کہ اب لاکھ جب اچھے اعمال بجا لاؤں مگر میری نسبت جو فیصلہ ہو گیا ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتا تو اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی خواہش نفس کے برخلاف اچھے اعمال کا پابند ہے۔ انسانی افعال کی اصلاح موقوف ہے اس عقیدہ پر کہ خدا کے فیصلوں میں انسان کے مختلف حالات کے لحاظ سے تبدیلی ممکن ہے۔

میں نے جو چند سرخیاں قائم کر دی ہیں اُن کے تحت میں آیاتِ قرآن کی کثیر التعداد صفیں قائم ہو سکتی ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی خصوصی آیات ہیں جو بدا کے مسئلہ کو قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں۔ چونکہ میں نے اس موضوع پر اب تک کبھی قلم نہیں اُٹھایا تھا اس لیئے یہاں میں نے ذرا تفصیل سے کام لیا اور اگر موقع ملا تو آئندہ ایک کتاب لکھنے کے لیئے یادداشت قلم بند کر دی آئندہ میں اگر نہ بھی لکھ سکوں تو اسی مختصر تبصرہ کو سامنے رکھ کر کسی دوسرے صاحب قلم کے لیئے مبسوط کتاب کی تصنیف کر لینا بالکل آسان ہے۔

نبوّت

الٰہیات کے بعد نبوت کا درجہ ہے، پیغمبر کی ضرورت کے

نہیں ہوا اور جبکہ نبی کی نبوت کو ہم خدا کی طرف سے تسلیم کر چکے تو اب
اگر نبی اپنے اختیارات کی بنا پر کسی کو اپنا جانشین مقرر کرے تو کسی
دوسرے کو اُس میں چون و چرا کا یا اس کے خلاف اپنے حق انتخاب
کے پیش کرنے کا کیا حق ہے۔
چونکہ ہمارے افراد جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور ہر جگہ ہیں
خود غرضی اور مطلب براری اُن کے پیش نظر رہتی ہے اس لیے اُن
کا انتخاب بالکل بے لوث اور غیر جانبدارانہ نہیں سمجھا جا سکتا اور
اُس میں غلطی کا بھی امکان ہے لہذا ضرورت ہے کہ ہادی خلق کو خدا
اپنی جانب سے معین کرے اور جس طرح نبی اُس کی طرف سے مبعوث
ہوتا ہے اُسی طرح نبی کا جانشین بھی اُسی کی طرف سے ہو۔
وہ کہ جو امام کے انتخاب کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں وہ اُس کے
لیے معصوم ہونا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ عام افراد کی نگاہ عصمت
تک جا ہی نہیں سکتی۔
مگر جبکہ امام کا تقرر خدا کی طرف سے ہے تو اُسے معصوم ہونا بھی
ضروری ہے ورنہ اُس کے ہاتھوں خلق خدا کی گمراہی کا احتمال ہوگا
اور اس کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوگی۔
اس کا عملی نتیجہ وہی ہے کہ جو ہم نے عصمت انبیاء میں اس کے

کے ارتکاب کی کوئی اہمیت نہین باقی رہے گی بلکہ مین تو یہ سمجھتا ہون کہ یہ عقیدہ دنیا کو ارتکاب گناہ کی دعوت دیتا ہے کیونکہ ہر شخص سمجھے گا کہ جب انبیاء ایسے بلند افراد ایسے افعال کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو ہمارے لیے ان کا ارتکاب کیا قابل الزام ہو سکتا ہے

اس کے خلاف یہی عقیدہ کہ انبیاء کا دامن گناہون سے بالکل بری ہے خلق خدا کی اصلاح اور عملی تکمیل کا باعث اور اُس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

امامت

رسول کے بعد ہدایت خلق اور فرائض دینیہ کے قیام کے لیے ایک حاکم و فرمانروا کی ضرورت ہے مسلمانوں میں سے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اس کے انتخاب کا حق جمہور اُمت کو ہونا چاہیئے۔

وہ کہتے ہیں کہ امامت کو بطور نامزدگی رسول کی جانب سے قرار دیا جانا اور یکے بعد دیگرے امامون کا سلسلہ ہونا اصول جمہوریت کے خلاف ہے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جمہوریت کا اصول تو اُسی وقت شکستہ ہو گیا جب نبی کا انتخاب ہمارے قبضہ میں

اچھے کو اچھا اور برُے کو برُا کہنا "وطرت آزاد" کا ایک طبعی تقاضا ہے جس سے انکار کرنا فطرت سے جنگ کا مرادف ہے مگر وہ لوگ کہ جو اپنی طرف کسی نشیب کا احساس کرتے ہیں اس کے شدت کے ساتھ مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اچھے کو اچھا تو کہو مگر برُے کو برُا ہرگز نہ کہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ملت اسلامیہ کے ایک بالغ نظر عالم اور بڑے سیاسی رہنما ہیں اپنے ایک مضمون میں اس موضوع پہ بہت واضح تبصرہ کیا ہے جو امامیہ مشن کی جانب سے "خلاوت ووست امامیہ" حصہ پنجم کے ساتھ بطور ضمیمہ شایع کیا گیا ہے آپ کو اُس سے تولا و تبرا کا عملی نتیجہ بھی معلوم ہو جائے گا حقیقتہً برائیوں سے نفرت مکمل نہیں ہوتی جب تک برُے افراد کو انسان برُا نہ سمجھے اور علیحدگی کا اُن سے احساس قائم نہ رکھے اور برے افراد سے بے تعلقی کا مظاہرہ انسان کی ذہنیت میں برائیوں سے علیحدگی اور بے تعلقی کا جذبہ اس طرح راسخ کر دے سکتا ہے کہ جس کے بعد انسان خود اپنے اعمال سے ان چیزوں کا ہرگز مرتکب نہ ہو۔

معاد

جزا و سزا کے لیے اس زندگی کے بعد ایک دوسرا دور مقرر

پہلے ذکر کیا ہے یعنی جب امام، پیشوا اور رہنما گناہوں کا مرتکب ہے تو عام افراد کی نگاہ میں گناہ سے کوئی خوف باقی نہیں رہے گا بلکہ ان کو ارتکاب گناہ کی ایک سند ہاتھ آئے گی۔ افراد بشر کو گناہوں سے علیحدہ رکھنے کے لیے یہی عقیدہ زیادہ فائدہ رسان ہے کہ ائمہ گناہوں سے علیحدہ اور معصوم ہوتے ہیں۔

تولّا و تبرّا

یہ عقیدہ امامت کا ایک ضمیمہ ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ جو اہل فضیلت اور سچے رہنما ہیں ان کے ساتھ موالات اور جو غلط دعویدار یا جھوٹے رہنما ہوں ان سے علیحدگی، بیزاری اور بے تعلقی لازم ہے۔ پہلے کا نام ہے تولّا دوسرے کا نام ہے تبرّا ان دونوں کا تعلق ہے عقیدہ و عمل سے۔ جن کا تعلق روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہے۔ رہ گیا زبان سے اس کا اظہار تو وہ اعتقاد اور ضمیر کے اقرار کا لازمی نتیجہ ہے جبکہ حالات سازگار ہوں اور دل کی بات کو دل میں مخفی رکھنے کا کوئی مخصوص سبب نہ ہو۔ اظہار حق بہرحال انسان کا فطری حق ہے بے شک اجتماعی و تمدنی مصالح کے لحاظ سے خود انسان کو اپنی نگرانی کرنا ضروری ہے

ہوا تو چونکہ اس عالم میں عقل و شعور ہی مفقود ہوتا ہے اس لیئے
اب اُس کے اعمال ایسے نہیں سمجھے جا سکتے جو جزا و سزا کا تقاضا
رکھتے ہوں لہذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ روح پھر کسی دوسرے
قالب میں جائے اور اگر وہاں جائے تو اُسے نہ کوئی راحت
ہونا چاہیئے نہ کوئی تکلیف۔ حالانکہ اُن کے خیال میں روح کا
سلسلۂ تناسخ کبھی ختم نہیں ہوتا اور سعادت و شقاوت یعنی
راحت و تکلیف سے دنیا کا کوئی ذی روح بالکل خالی نہیں ہے
پھر یہ دیکھیے کہ روحیں حادث نہیں قدیم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی
روحوں کی پیدا وار تو ہوگی نہیں اب غور کیجیئے کہ ازل میں سب
روحیں قالب انسانی میں تھیں یا کچھ حیوانات اور کچھ نباتات
اور کچھ جمادات کی شکل میں - اس صورت میں اوّل تو کوئی
باعث ہی اس کا نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ روحوں کو حیوانات
یا نباتات یا جمادات کی شکل میں رکھا جائے حالانکہ یہ بداعمالیوں
کا نتیجہ ہوتا ہے اور بداعمالیاں حادث چیزیں ہیں جو بعد کو ہوتی
ہیں اس کے علاوہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ روحیں جو قالب انسانی
میں ہیں یہ بھی مختلف طرح کے اعمال کریں گی جن میں سے بعض
حیوانات کے قالب میں جائیں گی، بعض نباتات اور بعض جمادات کے

ہے، جہاں نیک اور بد اعمال کا اچھا اور بُرا بدلا دیا جائے گا
یہ تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے مگر آریہ لوگ جزا و سزا
کے لیے ایک دوسری صورت تجویز کرتے ہیں جس کا نام ہے "تناسخ"
اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی روح ایک جنم میں جو نیک اعمال
یا بد اعمال کرتی ہے ان کا بدلا دوسرے جنم میں دیدیا جاتا ہے
خواہ دوسرے انسان کے قالب میں یا جانور، درخت یا پتھر کی شکل
میں، اُن کا خیال ہے کہ روح اور مادّہ دونوں قدیم ہیں اور
روح برابر مختلف جسموں میں چکر لگاتی رہتی ہے اور یہ "آواگون"
کا چرخا برابر چلتا رہتا ہے اور کبھی ختم ہونے والا نہیں۔
یہ مذہب عقلی حیثیت سے بالکل غلط ہے۔

جزا و سزا کا اصلی راز حقیقتہً اُس کا احساس راحت یا الم میں
مضمر ہے جو انسان کو حاصل ہوتی ہے اور جس کا تعلق شعور و
ادراک سے ہے اور وہ اس تناسخ کی صورت میں بالکل مفقود ہے
کیونکہ جب کوئی روح نئے جنم میں آتی ہے تو اُسے کوئی احساس
نہیں ہوتا کہ اُس کے پہلے جنم میں کیا کیا تھا۔ اور کس کا کیا بدلا
ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ اگر اس کو نیا جنم جانور یا درخت یا پتھر کا حاصل

اس سب سے قطع نظر کر کے اس سلسلۂ لا تناہی پر ایک اصولی اعتراض ہے اور وہ یہ کہ جزا کے مفہوم میں یہ مضمر ہے کہ اُس کے پہلے عمل مقدم ہو اس لیے ایک ایسا نقطہ ماننا لازمی ہے کہ جہاں پر عمل ہو اور وہ بطور جزا نہ ہو۔ اس طرح یہ سلسلہ تناہی ہو جاتا ہے اور اب پہلے انسان کے متعلق یہ سوال ہوگا کہ کیا وہ دنیا میں خوشی اور رنج دونوں سے خالی رہا ہوگا حالانکہ یہ بالکل فطرت کے آئین کے خلاف ہے۔

آریوں کی طرف سے تناسخ کے ثبوت میں اُن آیات قرآنی کو پیش کیا جاتا ہے جن میں بعض امم سابقہ کے مسخ ہونے کا تذکرہ ہے حالانکہ مسخ اس تناسخ سے بالکل مختلف چیز ہے وہاں روح اُس جسد کو چھوڑتی نہیں بلکہ اُسی جسم کی شکل میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور تناسخ میں وہ پہلا شخص مرجاتا ہے اُس کی لاش بے جان ہوتی ہے اور یہ روح یہاں سے نکل کر کسی اور شکم مادر سے عنقریب متولد ہونے والے بچہ کے اندر پہونچتی ہے اور اُس کے ساتھ متولد ہوتی ہے۔ بھلا اُس کو اس سے کیا تعلق پھر یہ کہ مسخ صرف بعض امم کے لیے بطور دنیوی عقوبت کے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عام نظام جزا و سزا کا یہی ہے

اور پھر وہ کہ جو انسان کی شکل میں آئیں گی ان میں بھی یہ تفریق قائم رہے گی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد انسانی کی مردم شماری میں برابر کمی ہوتی رہے اور یہ تعداد برابر گھٹتی رہی حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف شاہد ہے اگر یہ کہا جائے کہ حیوان اور نبات اور جماد کے دورے گزر کے اور سزا حاصل کر کے پھر روحیں پاک ہوتی ہیں اور انسانوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو یہ افراد انسانی جو اس دور کو ختم کر کے آنے والی روحوں کے حامل ہیں ان کو نہ رنج ہونا چاہیئے، نہ کوئی راحت نہ کوئی مسرت انھیں حاصل ہونا چاہیئے، نہ کوئی تکلیف۔ یہ بھی بالکل مشاہدہ کے خلاف ہے دنیا کی کوئی فرد ان حالات سے ہرگز خالی نہیں ہے۔

بہت سے وہ بچے ہیں جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں انھیں دنیا میں نہ چین نصیب ہوتا ہے نہ تکلیف۔ اس کا کچھ سبب معلوم نہیں ہوتا جبکہ روح کے نئے جسم میں لانے کا مقصد صرف جزا و سزا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس کا دنیا میں آکے مر جانا ہی اس کے جزا و سزا کے لیے کافی ہے تو پھر اس کے آگے سلسلہ چلنے کا کوئی باعث نہیں جبکہ اس دور میں کچھ ایسے اعمال نہیں جس کے لیے سزا و جزا کا موقع ہو۔

کے مطابق ہوگی اور انہیں ہرگز نہ تو کسی الم نقصان و تکلیف کا احساس نہ ہوگا۔

دیوانہ جو جہان ایک انسان نے سمجھا ہی نہ ہو افسوس ہے مگر بہ افسوس دوسرے کرتے ہیں وہ ہرگز اس پر متاسف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس میں ایک کیف اور لذت محسوس کرتا ہو۔

"دیوانہ باش تا غم تو دیگران خورند"

اور پھر اگر سزا کی نوعیت اس انسان کی افتاد طبع کے مطابق بھی ہو۔ مثلاً غلہ کے چور کو چوہے کی شکل یا پانی کے چور کو مینڈک کی شکل، اور کسی بڑے مقدس انسان کے قاتل کو گائے کی شکل حالانکہ اس ذریعہ سے وہ خود ایک بڑے طبقہ کے نزدیک مقدس اور قابل تعظیم ہوگیا۔

ہرگز اس طرح کی سزا کا خیال وہ نہیں ہے کہ جو انسان کے دل و دماغ پر اثر کرے اور اس کو اپنے اعمال کی نگہداشت پر مجبور کرے برخلاف جزا و سزا کی ان تصویروں کے جو اسلام نے پیش کی ہیں جن میں زیادہ نمایاں احساس راحت اور وجدان تکلیف و الم کا ہے۔

پڑھیے قرآن کی یہ آیتیں۔

اور اس کے علاوہ روزِ آخرت کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

عقیدۂ تناسخ کے لحاظ سے انسانوں کے اعمال اور ان کی زندگی کی نوعیت اُن کی اختیاری نہیں ہے کیونکہ سابقہ دور میں جیسے اعمال کیے ہوں گے اس طرح کی زندگی انھیں نصیب ہوگی۔ ایک ڈاکو ہے تو وہ اس ڈکیتی پر مجبور ہے کیونکہ یہ نتیجہ ہے اس کے پہلے جنم کے اعمال کا اور وہ اس کے قدرت و اختیار کے حدود سے باہر ہیں۔ انسان کا ہر حال ماضی کے ساتھ وابستہ ہے اور ماضی اختیار سے باہر۔ اس لیے انسان کا کوئی دور اس کا اختیاری نہیں قرار پاتا اور اس طرح جزا و سزا کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال اب دیکھیے کہ اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے جزا و سزا کا کون سا عقیدہ زیادہ کارگر اور مفید ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ انسان حقیقتہً جو ڈرتا ہے وہ اپنی تکلیف اور نفس کی اذیت سے، کیسی ہی حالت ہو مگر وہ یہ سمجھ لے کہ اس میں کوئی ایذا نہیں ہے تو وہ ہرگز اس سے کوئی خوف نہ کرے گا انسان کا آئندہ جنم میں کسی شکل میں منتقل ہو جانا افراد انسانی کو وحشت زدہ اور متاثر نہیں کرے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس جنم میں وہ ظاہر ہوں گے ان کی فطرت و طبیعت اسی جنم

نفسانی حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کے لیے اصلاح نفس اور اُس کے اعمال کا جائزہ لینے کی ایک بہترین تحریک ہے۔

گزشتہ بیانات کا نتیجہ

مذکورۂ بالا بیانات سے صاف معلوم ہوا کہ وہی عقائد حقہ جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے انسانی افعال و اعمال کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہوسکتے ہیں۔

اب اگر ہم دیکھیں کہ ہمارے مذہبی افراد اپنے افعال و اخلاق کے لحاظ سے دوسری قوموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے بلکہ اکثر حیثیتوں سے پستی میں ہیں تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ عقائد حقیقتہً ہمارے دلوں میں راسخ ہی نہیں ہوئے ہیں اور اُن کا پورا اثر ہمارے دماغوں پر قائم نہیں ہوا ہے۔

ہم کو کوشش کرنا چاہیے کہ جن عقائد کی ہم زبان سے تبلیغ کرتے ہیں ہمارے افعال و اعمال بھی ان ہی کی ترجمانی کریں جب ہی ہم صحیح طریقہ سے ان عقائد کے معتقد سمجھے جاسکتے ہیں۔

بہرحال ہم اگر اپنے بچوں کو صحیح طور پر مسلمان مومن بنانے

لھم فیھا زفیر و شھیق ---

ویقول الکافرون ھذا یوم عسر ---- یوم یعض الظالم
علی یدیہ اور کفار کی تمنائیں اور حسرتیں - یا حسرتی علی
ما فرطت فی جنب اللہ - ربنا ارجعون نعمل عملا صالحا
وما ترکت وغیرہ اس سے براہ راست شعور و احساس کا اندازہ
ہوتا ہے اور یہ وہ ہے کہ جو دلوں کو اس عذاب کی اہمیت
سے متأثر کرتا اور اصلاح اعمال کی فکر دامنگیر کرتا ہے -

بے شک اسلامی عقیدہ میں بھی اس دنیا کی جزا و سزا کا
پتہ ملتا ہے مگر وہ ہر شخص کو خود اس جنم میں کہ جس میں اُس نے
اعمال کیئے ہیں - ممکن ہے کہ اُس کو بعض نعمتیں عطا ہوں -
اُس کی کسی نیک عمل کی جزا میں یا کوئی مصیبت ڈالی جائے اُس
کے کسی برُے عمل کی سزا میں - مگر اس سے روز آخرت کی ضرورت
اور اُس کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور خود یہ خیال
کہ ہمیں ہمارے اعمال کا پھل اس دنیا میں بھی مل سکتا ہے
دنیا کو اصلاح عمل کی دعوت دینے کا ایک ذریعہ ہے جس طرح
یہ آیت کہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم
جس کا مفاد یہ ہے کہ خدا کے انعام و عطا کی تبدیلیاں اُن کے

کا خیال رکھتے ہیں تو بچپنے ہی سے ہمیں اُن کو مذکورہ عقائد کی تعلیم دینا چاہیئے نہ صرف اس طرح کہ انھیں دینیات کی کتابوں کے الفاظ رٹوا دیئے جائیں بلکہ اس طرح کہ وہ عقائد اُن کے ذہن نشین ہو جائیں اور وہ انھیں سمجھ لیں اور یقین کر لیں یہاں تک کہ اُن کی کالج اور اسکول کی زندگی میں اُن کے ان عقائد پر کوئی اعتراض کیا جائے تو وہ جواب نہ دے سکیں نہ سہی مگر انھیں اضطراب ضرور پیدا ہو کہ ہمارے مذہب پر یہ اعتراض ہوا ہے تو ہمیں اُس کا جواب دریافت کرکے پیش کرنا چاہیئے، اگر ہماری نوخیز نسل میں یہ جذبۂ تحقیق اور کاوشِ طلب پیدا ہو جائے تو یہی اُن کے مذہب کی حفاظت کا بہت بڑا قلعہ ہوگا کیونکہ ہمارا مذہب طاقتور ہے وہ اعتراضات و توہمات سے متزلزل نہیں ہو سکتا۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس اعتراض کے دفعیہ کا خیال اور اس کے متعلق تحقیق اور جستجو کا جذبہ پیدا ہو۔

تمام شد

حصہ اول